# گرہن

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

# گرہن

راجندر سنگھ بیدی

سنہ ۱۹۴۲ء

مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ

”ہولی کے نام“

# فہرست


پیش لفظ ........................................ ۱۰

گرہن ........................................ ۱۴

رحمان کے جوتے ........................................ ۳۲

ٹکی ........................................ ۵۰

اغوا ........................................ ۶۷

غلامی ........................................ ۸۹

ہڈیاں اور پھول ........................................ ۱۱۲

زین العابدین ........................................ ۱۲۹

لاروے ........................................ ۱۶۳

گھر میں، بازار میں ........................................ ۱۷۷

دوسرا کنارہ ........................................ ۱۹۴

آلو......................................................................................... ۲۱۹

معاون اور میں ........................................................................... ۲۳۵

چیچک کے داغ ......................................................................... ۲۵۶

ایوالانش ................................................................................. ۲۷۱

# پیش لفظ

جیسے ہم کہتے ہیں کسی دَور صحت مندی وقت کا اور طاقت کا اندازہ اس دور کے ادیب کی حالت سے لگایا جاسکتا ہے، ویسے ہی اس بات کا اُلٹ بھی درست ہے۔ یعنی ادب کی اچھائی یا برائی اندازہ کسی دَور کی صحت و تنو مندی پر مبنی ہے۔ ہمارا ملک ایک خاص قسم کی جسمانی و ذہنی غلامی اور جمود کی حالت میں سے گذر رہا ہے اور وہ تمام طبعی طاقتیں جو افادی ادب کی تخلیق کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں ابھی جمع نہیں ہوئیں۔ ہمارے ادیب ملازمتوں اور دیگر معیّن و غیر معیّن

نامساعد حالات میں گِھرے ہوئے ہیں۔ وہ دن میں، دفتروں میں نو دس گھنٹے کام کرنے کے بعد تخلیقی ادب نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان حالات میں جبکہ ان کے دماغ کو استراحت نہیں، ان کے اعضا تھکاوٹ سے چور ہیں اور جسم کے تمام قوا مضمحل تو ہمارا ان کے متعلّق اپنی توقعات کو بلند کرنا عبث ہے۔

ایک نیا اور اہم دَور کٹھالی میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی اُمس ہوتی ہے۔ اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے۔ اس میں کوئی جنبش، کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و ارلافی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں قطعاً مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ترقّی پسندی کے رسوائے عام نام کے تحت جو جنسی کیچڑ اُچھالا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انحطاطی دَور کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن ع

اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

ہمیں نااُمّیدی اور یاسیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

"دانہ و دام" کے بعد میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ پیش کرتا ہوں۔ افسانوں کے اس مجموعہ میں وہ تمام نظری کمزوریاں ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں لیکن میں مایوس نہیں اور بقدر ہمّت آگے قدم اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فارم کی نسبت میرے لئے نفسِ مضمون کا مسئلہ زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ اور جہاں مضمون کا تعلق ہے وہی ادبی تخلیق زیادہ کامیاب ہو گی جو اپنے محور کے گرد نزدیک رہے۔ مثلاً ہم اپنے مزدور کی زبان کا یوپی کے مزدور کی زبان مین ترجمہ کریں۔ تو ہماری تخلیق ایک ناقابلِ تصنع کی حامل ہو گی۔ میرا ماحول اگر پنجابی ہے اور میں پنجابی اُردُو لکھتا ہوں تو کوئی قصور نہیں کرتا بلکہ اپنے فرض کا ثبوت دیتا ہوں۔

اب میں اپنی فارم کے تحت ایک اور بات کہہ دوں۔ مجھے تخیلی فن میں یقین ہے۔ جب کوئی واقع مشاہدے میں آتا ہے تو میں اُسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ ایک حقیقت اور تخیّل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اُسے احاطہ میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہارِ حقیقت کے لیے ایک رومانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا بجائے خود کسی حد تک ایک رومانی طرزِ عمل ہے اور اس

اعتبار سے مطلق حقیقت نگاری بحیثیت فن غیر موزوں ہے۔ اس مجموعے کے پہلے افسانے کی متوازیات (Parallelisms) میرے مطلب کی وضاحت کرتی ہیں۔ لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفسِ مضمون کا محض ظاہری (Physical) پہلو پیدا ہوا۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلّق تھا لیکن اس کے بعد میرے خیال نے طنز کی صورت میں ایک باطن پہلو تلاش کر لیا۔ ذہن و تحریر میں دونوں کی نشو و نما ساتھ ساتھ ہوئی اور پھر یہ دونوں آپس میں یوں گھُل مِل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی۔ و علی ہذا القیاس۔

رشی نگر لاہور

۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء

راجندر سنگھ بیدی

# گرہن

روپو، شِبو، کتھّو اور منّا۔۔۔ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی، جسے پہلے پہل میّا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سُندرتا کا رسیلا حاسد تھا، گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند، گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا اپھاڑ سکے۔ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں

گے۔ وہ سی نہ سکتی تھی۔ منہ سلا بچّہ پیدا ہو گا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچّے کے چہرے پر لکھے جائیں گے۔ اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا۔ لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیّہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلہ پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میّا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہیے، وگرنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثرانداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی مٹیالی میّا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں، تین مردوں،

دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی۔۔۔

دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی۔ پھر جانوروں کے لیے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی، حتیٰ کہ اس کے کولہے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر میّا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میّا اور کائستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک شکم پُر کتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جمائی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے، وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ دیو گرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیو گرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کائستھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتّوں سے بھی بُرا سلوک

ہوتا تھا۔ کائستھوں کو تو بچے چاہئیں۔ ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی کل ودھود (کل کو بڑھانے والی۔۔۔بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لیے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لیے اسے حمل کے شروع چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیے جاتے تھے۔

"دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی تھی "اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں برے ہیں، اور بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟ رسیلا کی بات تو دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھُری سے مارے اس چھُری کا بھلا! لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور میّا کی تو بات ہی علاحدہ ہے۔ شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی۔"

راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں۔ اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا راکھشس، شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر آتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ مُنّا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا۔ کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میّا آئی اور آتے ہی

بولی، ’’بہو! اناج رکھا ہے کیا؟‘‘

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی، ’’ہاں ہاں۔۔۔ رکھا ہے۔۔۔ نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی میّا۔‘‘

’’تو بیٹھی کر کیا رہی ہے، نباب جادی؟‘‘

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی، ’’جی، مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟‘‘

میّا لاجواب ہو گئی اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لیے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی، ’’تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے جو، بچّہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اسے پالنے چلے گی؟‘‘

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہو جائے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میّا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گُچھّا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمعدان

کے قریب سرمہ پیسنے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گُچھّا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُر ہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھُوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا، ''میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟''

''جلدی کیسی؟''

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''یہی۔۔۔ تم بھی تو کتیا ہو، کتیا۔''

ہولی سہم کر بولی، ''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی۔ رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر

دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میّا ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصّہ نہ آیا، البتہ میّا کی اس عادت سے جل بھُن گئی، ”رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی جیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے۔“

ہولی سوچتی تھی کل رسیلا نے مجھے اس لیے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اور آج اس لیے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔ کیوں گالیاں دیتا ہے۔ میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ نہیں دکھائی دیتا۔ اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں، یہ مرد!

میّا نے کچھ باس متی، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا، یہ میّا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باس متی چاول پیندے میں چمٹ گئے تو بہو مرتی کرتی پھوہڑ ہو گئی اور آپ اتنی

سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پینڈا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر پر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی۔ "لے، دھو ڈال۔"

اب ہولی نہیں جانتی بے چاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے، ہِلے یا نہ ہِلے، وہ کُتّیا ہے یا نباب جادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہو گا۔ بچہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح چُر مُر سا پیدا ہو گا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا بُرا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علاحدہ ہے کیونکہ یہ کوئی سننے کے لیے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے، سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آ گیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں۔

ماہندی تو ادی مالوے

اینو رنگ گیو گجرات رے

ماہندی رنگ لاگیو رے

(ماہندی (حنا) تو مالوہ۔۔۔ وسط ہند میں پیدا ہوئی۔ اس میں گجرات رنگا ہوا ہے۔ گویا اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔)

اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی، ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ نباب جادی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں۔ وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پُن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر ترویدی گھاٹ پر اشنان کے لیے چلی جاتی ہیں۔ پھول، ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منھ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد

عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے رہے ہیں، اشنان سے سب پاپ دھُل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے۔ ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں، پھر گہنا جاتے ہیں۔ پھر دیا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک وصاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لیے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس، شنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جمگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے ہوئے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں، کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔

نرم دل ہندو دان دیتا ہے تا کہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لیے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے۔ چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند، گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا، ہولی نے بچوں کو بڑے کائستھ کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لیے چلی۔

اب میّا، رسیلا، بڑا لڑکا شِبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھُول تھے۔ گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا، جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی، تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی۔ کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھوئے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصّہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروبِ آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے

خلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسّے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ دیو گرام کی طرف روانہ ہو گا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں۔ اور پھر وہی اماں۔ کنوار پن اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آ چکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علاحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لیے۔ اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار بعید الفہم طاقت ہے۔ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا۔ دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی۔ آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں۔ سارنگ دیو گرام کے سامنے۔ وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا۔ مرغی۔۔۔ دولے۔۔۔ چابیاں میرے پاس ہیں۔۔۔ پانی زیادہ ہو گا۔

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آب کاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا، عین جب کہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی،

ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیو گرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتہ سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاوں سے باہر نکلا تھا اور سابر متی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجاہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی۔ ''کتھو رام۔'' کتھو رام نے بھی سیتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا۔ کتھو رام بولا۔ ''ہولے''۔

ہولی یقین سے معمور مگر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی ''کتھو بھیّا مجھے سارنگ دیو گرام پہنچادو۔''

کتھو رام قریب آیا۔ ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''سارنگ دیو جاؤ گی ہولے؟'' اور پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟'' ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا۔ ''بے چاری کوئی دُکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' کتھو رام نے ہولی کو ساتھ لیا اور

لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہولے کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو؟“

”ہاں۔“

”یہ سریپھ جادیوں کا کام ہے؟ اور جو میں کائستھوں کو خبر کر دوں تو؟“

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جادی تھی اور نہ سریپھ جادی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کتھو رام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے رسے ڈھیلے کیے گئے۔ ایک ہلکی سی وِسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیو گرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کتھو رام بولا، ”ڈرو نہیں ہولے۔۔۔ میں تمھاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پَو پھٹے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات

سرائے میں آرام کرلو۔"

کتھورام، ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کتھورام اور اس کے ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا، تو اس نے کتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟" کتھو رام نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کتھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کتھورام اندر آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بُو آرہی تھی۔

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھُول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لیتی گئی۔ دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف۔ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ پھر شنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، بگٹٹ۔ وہ گرتی تھی، بھاگتی

تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی۔ اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا جاچکا تھا۔ راہو اور کیتو دونوں نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔ دودھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لیے سراسیمہ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور، اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔

دان کا وقت ہے۔

چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔

ہر پھول بندر سے آواز آئی۔

پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔

چھوڑ دو۔ دان کا وقت ہے۔ پکڑ لو۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔

# رحمان کے جوتے

دن بھر کام کرنے کے بعد، جب بوڑھا رحمان گھر پہنچا تو بھوک اسے بہت ستا رہی تھی۔ جینا کی ماں، جینا کی ماں، اس نے چلاتے ہوئے کہا۔۔ کھانا نکال دے بس جھٹ سے۔ بڑھیا اس وقت اپنے ہاتھ کپڑوں لتوں میں گیلے کیے بیٹھی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ پونچھ لے، رحمان نے ایک دم اپنے جوتے کھاٹ کے نیچے اتار دیے، اور کھدر کے ملتانی تہمد کو زانوؤں میں دبا، کھاٹ پر چوکڑی جماتے ہوئے بولا۔۔۔ بسم اللہ!

بڑھاپے میں بھوک جوان ہو جاتی ہے۔ رحمان کا بسم اللہ بڑھاپے اور جوانی کی اس دوڑ میں رکابی سے بہت پہلے اور بہت دور نکل گیا تھا اور ابھی تک بڑھیا نے سبجی اور نیل میں بھگوئے ہوئے ہاتھ دوپٹے سے نہیں پونچھے تھے۔ جینا کی ماں برابر چالیس سال سے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی آئی تھی اور رحمان قریب قریب اتنے ہی عرصے سے خفا ہوتا آیا تھا، لیکن آج یک لخت وہ خود بھی اس وقت بچانے والی عادت کو سراہنے لگا تھا۔ رحمان بولا۔ ''جینا کی ماں، جلدی ذرا۔۔۔'' اور بڑھیا اپنی چوالیس سالہ دقیانوسی ادا سے بولی۔ ''آئے ہائے، ذرا دم تو لے بابا تو''!

سوءِ اتّفاق رحمان کی نگاہ اپنے جوتوں پر جا تھمی، جو اس نے جلدی سے کھاٹ کے نیچے اتار دیے تھے۔ رحمان کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ گیا تھا۔ یہ مستقبل قریب میں کسی سفر پر جانے کی علامت تھی۔ رحمان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج پھر میرا جوتا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جینا کی ماں۔۔۔ اللہ جانے میں نے کون سے سفر پہ جانا ہے۔''

''جینا کو ملنے جانا ہے اور کہاں جانا ہے۔۔۔'' بڑھیا بولی۔ ''یونہی تو نہیں تیرے

گو دڑ دھو رہی ہوں، بُڈھے! دو پیسے ڈبل کا تو نیل ہی لگ گیا ہے تمہارے کپڑن کو۔ کیا تو دو پیسے روج کی کمائی بھی کرے ہے؟"

"ہاں ہاں!" بُڈھے رحمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کل میں نے اپنی اکلوتی بچی کو ملنے انبالے جانا ہے۔ تبھی تو یہ جوتا جوتے سے نیارا نہیں ہوتا۔" پار سال بھی جب یہ جوتا جوتے پر چڑھ گیا تھا، تو رحمان کو پرچی ڈالنے کے لیے ضلع کچہری جانا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اس سال کا سفر اور جوتوں کی کرتوت اچھی طرح سے محفوظ تھی۔ ضلع سے واپسی پر اسے پیدل ہی آنا پڑا تھا، کیونکہ ہونے والے ممبر نے تو واپسی پر اس کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ اس میں ممبر کا قصور نہ تھا، بلکہ جب رحمان پرچی پر نیلی چرخی کا نشان ڈالنے لگا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس نے گھبرا کر پرچی کسی دوسرے ممبر کے حق میں دے دی تھی۔

جینا کو ملے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ جینا انبالے میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان دو سالوں میں آخری چند ماہ رحمان نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دھکتا ہوا اپلا اس کے دل پر رکھا ہوا ہے۔ جب اسے جینا کو ملنے کا خیال آتا تو اسے کچھ سکون، کچھ اطمینان میسر ہوتا۔ جب ملنے کا خیال ہی

اس قدر تسکین دہ تھا تو ملنا کیسا ہو گا؟ بڈھا رحمان بڑی حیرت سے سوچتا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو ملے گا اور پھر تلنگوں کے سردار علی محمد کو۔ پہلے تو وہ رو دے گا۔ پھر ہنس دے گا، پھر رو دے گا اور اپنے ننھے نواسے کو لے کر گلیوں، بازاروں میں کھلاتا پھرے گا۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ "جینا کی ماں!" رحمان نے کھاٹ کی ایک کھلی ہوئی رسی کو عادتاً گھسا کر کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔ "بڑھاپے میں یادداشت کتنی کمزور ہو جاتی ہے۔"

علی محمد، جینا کا خاوند، ایک وجیہہ جوان تھا۔ سپاہی سے ترقی کرتے کرتے وہ نائیک بن گیا تھا۔ تلنگے اسے اپنا سردار کہتے تھے۔ صلح کے دنوں میں علی محمد بڑے جوش و خروش سے ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ این ڈبلیو آر، پولیس مین، بریگیڈ والے، یونیورسٹی والے اس نے سب ہرا دیے تھے۔ اب تو وہ اپنی ایمٹی کے ساتھ بصرے جانے والا تھا، کیونکہ عراق میں رشید علی بہت طاقت پکڑ چکا تھا۔۔۔ اس ہاکی کی بدولت ہی علی محمد کمپنی کمانڈر کی نگاہوں میں اُونچا اُٹھ گیا تھا۔ نائیک بننے سے پہلے وہ جینا سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا، لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہی نظروں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا اسے پاؤں تلے نظر نہ آتی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مسز

ہولٹ، کمپنی کمانڈر کی بیوی نے تقسیم انعامات کے وقت انگریزی میں علی محمد سے کچھ کہا تھا، جس کا ترجمہ صوبیدار نے کیا تھا۔۔۔ میں چاہتی ہوں تمھاری اسٹک چوم لوں۔ علی محمد کا خیال تھا، لفظ اسٹک نہیں ہو گا، کچھ اور ہو گا۔ بڑا حاسد ہے صوبیدار۔ انگریزی بھی تو بس گوہانے تک ہی جانتا ہے۔

رحمان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے اپنے داماد سے نہیں بلکہ کسی بہت بڑے افسر سے ملنے جانا ہے۔ اس نے کھاٹ پر سے جھک کر جوتے پر سے جوتا اتار دیا، گویا وہ انبالے جانے سے گھبراتا ہو۔ اس عرصے میں جینا کی ماں کھانا لے آئی۔ آج اس نے خلاف معمول گائے کا گوشت پکا رکھا تھا۔ جینا کی ماں نے گوشت بڑی مشکل سے قصبے سے منگوایا تھا اور اس میں گھی اچھی طرح سے چھوڑا تھا۔ چھ ماہ پہلے رحمان کو تلی کی سخت شکایت تھی، اس لیے وہ تمام مولدات سودا، گڑ، تیل، بینگن، مسور کی دال، گائے کے گوشت اور چکنی غذا سے پرہیز کرتا تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں رحمان نے شاید سیر کے قریب نوشادر چھاچھ کے ساتھ گھول کر پی لیا تھا، تب کہیں اس کے سانس کی تکلیف دور ہوئی تھی۔ بھوک لگنے کے علاوہ اس کے پیشاب کی سیاہی سپیدی میں بدلی تھی، لیکن اس کی گردن

بدستور پتلی تھی۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی ویسے ہی نمایاں تھی۔ پلکوں پر کی بھر بھراہٹ بھی قائم تھی اور جلد کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہو گیا تھا۔ گائے کا گوشت دیکھ کر رحمان خفا ہو گیا۔ بولا۔۔۔ ''چار پانچ روز ہوئے تو نے بینگن پکائے تھے۔ جب میں چپ رہا۔ پرسوں مسور کی دال پکائی جب بھی چپ رہا۔ تو تو بس چاہتی ہے کہ میں بولوں ہی نہیں۔۔۔ مری مٹّی کا ہو رہوں۔ سچ کہتا ہوں تو مجھے مارنے پہ تلی ہوئی ہے۔ جینا کی ماں''!

بڑھیا پہلے روز سے ہی، جب اس نے بینگن پکائے تھے، رحمان کی طرف سے اس احتجاج کی متوقع تھی۔ لیکن رحمان کی خاموشی سے بڑھیا نے الٹا ہی مطلب لے لیا۔ دراصل بڑھیا نے قریب قریب ایک نکھٹّو آدمی کے لیے اپنا ذائقہ بھی ترک کر ڈالا تھا۔ بڑھیا کا سوچنے کا ڈھب بھی نیارا تھا۔ جب سے وہ پیٹ بڑھے ہوئے اس ڈھانچ کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی، اس نے سکھ ہی کیا پایا تھا۔ بھلا چنگا رحمان لدھیانے میں سپاہی تھا، لیکن ایک تربوز پر سے پھسل کر گھٹنا توڑ بیٹھنے سے اس نے پنشن پالی تھی اور گھر میں بیٹھ رہا تھا۔ بڑھیا نے کپڑے چھانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ ''تو نہ کھا بابا۔۔۔ تیری کھاطر میں تو نا مروں، مجھے تو روج دال، روج دال میں کچھ مجا

نہیں دیکھے۔"

رحمان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کھاٹ کے نیچے سے جوتا اٹھالے اور اس بڑھیا کی چندیا پر سے رہے سہے بالوں کا بھی صفایا کر دے۔ سر کی پشم کے اترتے ہی بڑھیا کا دائمی نزلہ دور ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی لقمے منہ میں ڈالنے کے فوراً بعد ہی اسے خیال آیا۔ تلی ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ کتنا ذائقے دار گوشت پکایا ہے میری جینا کی ماں نے۔ میں تو ناشکرا ہوں پورا پورا۔ اور رحمان چٹخارے لے لے کر ترکاری کھانے لگا۔ سالن کا تر کیا ہوا لقمہ جب اس کے منہ میں جاتا تو اسے خیال آتا، آخر اس نے جینا کی ماں کو کون سا سکھ دیا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ اب تحصیل میں چپراسی ہو جائے اور پھر اس کے پرانے دن واپس آ جائیں۔

کھانے کے بعد رحمان نے اپنی انگلیاں پگڑی کے شملے سے پونچھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نیم شعوری احساس سے اس نے اپنے جوتے اٹھائے اور انہیں دالان میں ایک دوسرے سے اچھی طرح علاحدہ علاحدہ کر کے ڈال دیا۔

لیکن اس سفر سے چھٹکارا نہیں تھا۔ ہر چند کہ اپنی آٹھ روزہ ملکی میں نلائی لازمی تھی۔ صبح دالان میں جھاڑو دیتے ہوئے بڑھیا نے بے احتیاطی سے رحمان کے

جوتے سر کا دیے اور جوتے کی ایڑی دوسری ایڑی پر چڑھ گئی۔ شام کے قریب ارادے پست ہو جاتے ہیں۔ سونے سے پہلے انبالے جانے کا خیال رحمان کے دل میں کچا پکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترائی میں نلائی کر چکنے کے بعد ہی وہ کہیں جائے گا، اور نیز کل کی مرغّن غذا سے اس کے پیٹ میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ لیکن صبح جب اس نے پھر جوتوں کی وہی حالت دیکھی تو اس نے سوچا اب انبالے جائے بنا چھٹکارا نہیں ہے۔ میں لاکھ انکار کروں، لیکن میرا دانہ پانی، میرے جوتے بڑے پر دین ہیں۔ وہ مجھے سفر پہ جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور صبح کے وقت ارادے بلند ہو جاتے ہیں۔ رحمان نے پھر اپنا جوتا سیدھا کیا اور اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

نیل میں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ کر رات ہی رات میں کیسے اُجلے ہو گئے تھے۔ نیلاہٹ نے اپنے آپ کو کھو کر سپیدی کو کتنا ابھار دیا تھا۔ جب کبھی بڑھیا نیل کے بغیر کپڑے دھوتی تھی تو یونہی دکھائی دیتا تھا جیسے ابھی انہیں جوہڑ کے پانی سے نکالا گیا ہو اور پانی کی مٹیالی رنگت ان میں یوں بس گئی ہو جیسے پاگل کے دماغ میں واہمہ بس جاتا ہے۔

جینا کی ماں اوکھلی میں متواتر دو تین دن سے جو کوٹ کر تندل بنا رہی تھی۔ گھر میں عرصہ سے پرانا گُڑ پڑا تھا جسے دھوپ میں رکھ کر کیڑے نکال دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سوکھی مکی کے بھٹے تھے۔ گویا جینا کی ماں بہت دنوں سے اس سفر کی تیاری کر رہی تھی اور جوتے کا جوتے پر چڑھنا تو محض اس کی تصدیق تھی۔ بڑھیا کا خیال تھا کہ ان تندلوں میں سے رحمان کا زاد راہ بھی ہو جائے گا اور بیٹی کے لیے سوغات بھی۔

رحمان کو کوئی خیال آیا۔ بولا۔۔۔ "جینا کی ماں بھلا کیا نام رکھا ہے انہوں نے اپنے ننھے کا؟"

بڑھیا ہنستے ہوئے بولی، "ساہق (اسحاق) رکھا ہے نام، اور کیا رکھا ہے نام انہوں نے اپنے ننھے کا۔ واہ! سچ مچ کتنی کمجور ہے تیری یادداش۔"

اسحاق کا نام بھلا رحمان کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔ جب وہ خود بھی ننھا تھا تو اس کے دادا کو بھی رحمان کا نام بھول گیا تھا۔ دادا کھاتا پیتا آدمی تھا، اس نے چاندی کی ایک تختی پر عربی لفظوں میں رحمان لکھوا کر اسے اپنے پوتے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ لیکن پڑھنا کسے آتا تھا۔ بس وہ تختی کو دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا۔ ان دنوں تو

نام گاموں شیرا، فتو، فجا وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ اسحاق، شعیب وغیرہ نام تو اب قصباتی لوگوں نے رکھنے شروع کر دیے تھے۔ رحمان سوچنے لگا۔۔۔ ساہق اب تو ڈیڑھ برس کا ہو چکا ہو گا۔ اب اس کا سر بھی نہیں جھولتا ہو گا۔ وہ گردن اٹھا میری طرف ٹک ٹک دیکھتا جائے گا اور اپنے ننھے سے دل میں سوچے گا، اللہ جانے یہ بابا، چٹے بالوں والا بوڑھا ہمارے ہاں کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ نہیں جانے گا کہ اس کا اپنا بابا ہے، اپنا نانا، جس کے گوشت پوست سے وہ خود بھی بنا ہے۔ وہ چپکے سے اپنا منہ جینا کی گود میں چھپا لے گا۔ میرا جی چاہے گا جینا کو بھی اپنی گودی میں اٹھا لوں۔ لیکن جوان بیٹیوں کو کون گودی میں اٹھاتا ہے۔۔۔ ناحق اتنی بڑی ہو گئی جینا۔ بچپن میں وہ جب کھیل کود کر باہر سے آتی تھی تو اسے سینے سے لگا لینے سے کتنی ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان دنوں یہ دل پر سلگتا ہوا اپلا رکھا نہیں محسوس ہوتا تھا۔۔۔ اب وہ صرف اسے دور سے ہی دیکھ سکے گا۔ اس کا سر پیار سے چوم لے گا۔۔۔ اور۔۔۔ کیا وہی تسکین حاصل ہو گی؟

رحمان کو اس بات کا تو یقین تھا کہ وہ ان سب کو دیکھ کر بے اختیار رو دے گا۔ وہ آنسو تھامنے کی لاکھ کوشش کرے گا، لیکن وہ آپی آپ چلے آئیں گے۔ وہ اس

لیے نہیں بہیں گے کہ تلنگا اس کی بیٹی کو پیٹتا ہے۔ بلکہ زبان کے طویل قصّوں کی بجائے، آنکھوں سے اس بات کا اظہار کر دے گا کہ جینا، میری بیٹی، تیرے پیچھے میں نے بہت کڑے دن دیکھے ہیں۔ جب چودھری خوشحال نے مجھے مارا تھا تو اس وقت میری کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں مر ہی تو چلا تھا۔ پھر تو کہاں دیکھتی اپنے ابے کو؟ لیکن بن آئی کوئی نہیں مرتا۔ شاید میں تمہارے یا ساہتے یا کسی اور نیک بخت کے پاؤں کی خیرات، بچ رہا۔ اور کیا ننھے کا لہو جوش مارنے سے رہ جائے گا؟ وہ ہمک کر چلا آئے گا میرے پاس، اور میں کہوں گا۔ ساہتی بیٹا، دیکھ میں تیرے لیے لایا ہوں تندل، اور گڑ، اور کھلونے اور۔۔۔ بہت کچھ لایا ہوں۔ ہاں، گاؤں کے لوگوں کا یہی گریبی دعویٰ ہوتا ہے۔ ننھا مشکل سے دانتوں میں پپول سکے گا کسی ہرے بھٹے کو، اور جب تلنگے سے میری تُوتُو مَیں مَیں ہو گی تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں گا۔ بڑا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ کل کی گلہری اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ ناراض ہو جائے گا۔ کہے گا، گھر رکھو اپنی بیٹی کو۔۔۔ پھر میں اس کے بیٹے کو اٹھائے پھروں گا۔ گلی گلی، بازار بازار۔۔۔ اور من جائے گا تلنگا۔

رحمان نے نلائی کا بندوبست کیا۔ کھڑی کھیتی کی قسم پر کچھ روپے ادھار لیے۔

سوغات باندھی۔ زاد راہ بھی، اور یکے پر پاؤں رکھ دیا۔ بڑھیا نے اسے اللہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "بصرے چلا جائے گا علیا چند روج میں۔ میری جینا کو ساتھ ہی لیتے آنا اور میرے ساہتے کو، کون جانے کب دم نکل جائے"!

ملکہ رانی سے مانک پور پہنچتے پہنچتے رحمان نے اسحاق کے لیے بہت سی چیزیں خرید لیں۔ ایک چھوٹا سا شیشہ تھا۔ ایک سیلولائیڈ کا جاپانی جھنجھنا جس میں نصف درجن کے قریب گھنگھرو ایک دم بج اٹھتے تھے۔ مانک پور سے رحمان نے ایک چھوٹا سا گڈیرا بھی خرید لیا تاکہ اسحاق اسے پکڑ کر چلنا سیکھ جائے۔ کبھی رحمان کہتا اللہ کرے، اسحاق کے دانت اس قابل ہوں کہ وہ بھٹے کھا سکے۔ پھر ایک دم اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ چلنا بھی نہ سیکھا ہو اور جینا کی پڑوسنیں جینا کو کہیں۔۔۔ ننھے نے تو اپنے نانا کے گڈیرے پر چلنا سیکھا ہے اور رحمان نہیں جانتا تھا کہ وہ ننھے کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے یا بڑے کو ننھا۔ صرف اس کی خواہش تھی کہ اس کے تندل، اس کے بھٹے، اس کا شیشہ، اس کا جاپانی جھنجھنا اور باقی خریدی ہوئی چیزیں سب سپھل ہوں۔ انہیں وہ قبولیت حاصل ہو جس کا وہ متمنّی ہے۔ کبھی وہ سوچتا، کیا جینا گاؤں کے گنوار لوگوں کے ان تحائف کو پسند کرے گی؟ کیا

ممکن وہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے ان چیزوں کو پا کر باغ باغ ہو جائے۔ لیکن کیا وہ صرف میرا جی رکھنے کے لیے ہی ایسا کرے گی؟ پھر تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔ کیا میرے تندل سچ مچ اسے پسند نہیں آسکتے؟ میری بیٹی کو، میری اپنی جینا کو۔ علیا تو پرایا پیٹ ہے وہ تو کچھ بھی نہیں پسند کرنے کا۔ وہ تو نائیک ہے۔ اللہ جانے، صاحب لوگوں کے ساتھ کیا کچھ کھاتا ہو گا۔ وہ کیوں پسند کرنے لگا۔ گاؤں کے تندل، اور مانک پور سے روانہ ہوتے ہوئے رحمان کانپنے لگا۔

رحمان پر جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رات کے گوشت نے اس کے پیٹ کا شیطان جگا دیا تھا۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی تو تھی ہی، لیکن کچھ سفر، کچھ مرغّن غذا کی وجہ سے آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ رحمان نے اپنے پیٹ کو دبایا۔ تلی والی جگہ پھر ٹھُس سی معلوم ہوتی تھی۔ جینا کی ماں نے ناحق گائے کا گوشت پکایا۔ لیکن اس وقت تو اسے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنا اور گائے کا گوشت دونوں چیزیں پسند آئی تھیں۔

رحمان کو ایک جگہ پیشاب کی حاجت ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا قارورہ سیاہی مائل گدلا تھا۔ رحمان کو پھر وہم ہو گیا۔ بہر حال، اس نے سوچا، مجھے پرہیز کرنا

چاہیے۔ پرانا مرض پھر عود کر آیا ہے۔

گاڑی میں، کھڑکی کی طرف سے، شمالی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ درختوں کے نظر کے سامنے گھومنے، کبھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے سے رحمان کو گاڑی بالکل ایک پنگھوڑے کی طرح آگے پیچھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین اسٹیشن ایک اونگھ سی میں نکل گئے۔ جب وہ کرنال سے ایک دو اسٹیشن پرے ہی تھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سیٹ کے نیچے سے گٹھری اٹھالی گئی تھی۔ صرف اس کے اپنے گزارے کے لیے تندل اور چادر کے پلو میں بندھے ہوئے مکی کے بھٹے رہ گئے تھے، یا اس کے پھیلے ہوئے پاؤں میں گڈیرا کھڑا تھا۔

رحمان شور مچانے لگا۔ اس ڈبے میں ایک دو اچھی وضع قطع کے آدمی اخبار پڑھ رہے تھے۔ بُڈھے کو یوں سیخ پا ہوتا دیکھ کر چلائے، ''مت شور مچاؤ، اے بُڈھے، مت غل کرو۔'' لیکن رحمان بولتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک بٹی ہوئی مونچھوں والا کانسٹیبل بیٹھا تھا۔ رحمان نے اسے پکڑ لیا اور بولا ''تو نے ہی میری گٹھڑی اٹھوائی ہے، بیٹا!'' کانسٹیبل نے ایک جھٹکے سے رحمان کو پرے پھینک دیا۔ اس

کھینچا تانی میں رحمان کا دم پھول گیا۔ بابو پھر بولے۔ ”تو سو کیوں گیا تھا بابا؟ تو سنبھال کے رکھتا اپنی گٹھڑی کو، تیری عقل چرنے گئی تھی بابا۔“

رحمان اس وقت ساری دنیا کے ساتھ لڑنے کو تیار تھا۔ اس نے کانسٹیبل کی وردی پھاڑ ڈالی۔ کانسٹیبل نے گڈیرے کا لٹھا کھینچ کر رحمان کو مارا۔ اسی اثنا میں ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔ اس نے بھی خوش پوش لوگوں کی رائے کا پلہ دیکھ کر رحمان کو گالیاں دینا شروع کیا اور رحمان کو حکم دیا کہ وہ کرنال پہنچ کر گاڑی سے اتر جائے۔ اسے ریلوے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ چیکر کے ساتھ لڑائی میں ایک لات رحمان کے پیٹ میں لگی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کرنال آ چکا تھا۔ رحمان، اس کی چادر اور گڈیرا پلیٹ فارم پر اتار دیے گئے۔ گڈیرے کی لٹھ، جسم سے علاحدہ، خون میں بھیگی ہوئی ایک طرف پڑی تھی اور مکی کے بھٹے کھلی ہوئی چادر سے نکل کر فرش پر لڑھک رہے تھے۔

رحمان کے پیٹ میں بہت چوٹ لگی تھی۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر کرنال کے ریلوے ہسپتال میں لے جایا گیا۔

جینا، ساہقا، علی محمد، جینا کی ماں۔۔۔ ایک ایک کر کے رحمان کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ زندگی کی فلم کتنی چھوٹی ہوتی ہے۔ اس میں بہ مشکل تین چار آدمی اور ایک دو عورتیں ہی آسکتی ہیں۔ باقی مرد عورتیں بھی آتی ہیں، لیکن ان میں سے کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔ جینا، ساہقا، علی محمد اور جینا کی ماں۔۔۔ یا کبھی کبھار انہی چند لوگوں کے لیے کشمکش کے واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں، مثلاً گڈیرا پلیٹ فارم پر پڑا ہوا، اور مکی کے لڑھکتے ہوئے بھٹے جنہیں خلاصیوں، واچ مینوں، سگنل والوں کے آوارہ چھوکرے اٹھا اٹھا کر بھاگ رہے ہوں اور ان کے کالے کالے چہروں میں سفید دانت بالکل اسی طرح دکھائی دیں، جیسے اس تاریک سے پس منظر میں ان کی ہنسی، ان کے قہقہے۔۔۔ یا دور کوئی پولیس مین اپنی ڈائری میں چند ضروری و غیر ضروری تفاصیل لکھ رہا ہو۔۔۔

پھر لات ماری۔۔۔

ایں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ اچھا، پھر لات ماری۔

اور پھر۔۔۔

پھر ہسپتال کے سفید بستر ے، کفن کی طرح منہ کھولے ہوئے چادریں، قبروں کی طرح چارپائیاں، عزرائیل نما نرسیں اور ڈاکٹر۔۔۔

رحمان نے دیکھا اس کی تندلوں والی چادر ہسپتال میں اس کے سرہانے پڑی تھی۔ "یہ بھی وہیں چھوڑ آئے ہوتے۔" رحمان نے کہا۔ "اس کی مجھے کیا ضرورت ہے؟" اس کے علاوہ رحمان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کے سرہانے کھڑے ہر لحظہ لٹھّے کی سفید چادر کو منہ کی جانب کھسکا دیتے تھے۔۔۔ رحمان کو قے کی حاجت محسوس ہوئی۔ نرس نے فوراً ایک چلمچی بیڈ کے نیچے سرکا دی۔ رحمان قے کرنے کے لیے جھکا اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے جوتے بدستور جلدی سے چارپائی کے نیچے اتار دیے تھے اور جوتے پر جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمان ایک میلی سی، سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا اور بولا۔۔۔ "ڈاک دار جی! مجھے سفر پہ جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا جوتا جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے؟"

ڈاکٹر جواباً مسکرا دیا اور بولا۔ "ہاں بابا، تو نے بڑے لمبے سفر پہ جانا ہے، بابا۔۔۔" پھر رحمان کے سرہانے کی چادر ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "لیکن تیرا زادِ راہ کتنا ناکافی ہے بابا۔۔۔ یہی فقط تندل اور اتنا لمبا سفر۔۔۔" "بس جینا، جینا کی ماں، ساہقا اور علی

محمد یاوہ افسوس ناک واقعہ۔۔۔۔

رحمان نے زادراہ پر اپناہاتھ رکھ دیااور ایک بڑے لمبے سفر پہ روانہ ہو گیا۔۔۔

# بُکی

"١٦؟"

"جی آں۔۔۔ ١٦، تیسری قطار میں"۔ بُکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاب، کنڈکٹر آپ کی مدد کرے گا۔"

"شکریہ، شکریہ" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چوّنی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ چوّنی جیب میں ڈالتے ہوئے بُکی نے آنکھیں بند کر

لیں، جیسے اس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی اور رات کو اس عظیم الشّان سینما میں ٹکٹیں بیچا کرتی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لیے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بُک کر دینے کے عوض اسے چونّی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کُنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی ہٹیلی ماں تھی جو کھانا ملنے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی، جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی، اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے۔۔۔

کچھ دیر بعد معمولے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کاؤنٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کاؤنٹر پر بجائیں اور بولا۔ ”لیکن مام۔۔۔ وہاں تو کوئی لڑکی نہیں۔“

بُکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا ”کہیں باہر ہو گی صاب۔۔۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔“

”اوف!“ نوجوان نے بیزاری سے کہا، ”ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے مس۔۔۔ مام۔

ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔"

پھر وہ لڑکا کچھ دور جا کر ساگوان کے خوبصورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے سلز کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے 'آج شب کو' کے سرخ لیبل پھاڑنے شروع کر دیے۔ پھر بُکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا۔ "مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے۔"

بُکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا اور دل ہی دل میں اس کے خوبصورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال۔ دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنجا نہیں۔ نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا۔ بس۔۔۔ ٹھیک ہے اور اس کے بال، دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بُو آتی ہے، حالاں کہ شاید اس نے شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے۔ جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بُو آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سینما کی چھت کا معائنہ کرنے

لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی، تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوبصورت دکھائی دیں گے۔ چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہو گا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہے گا۔۔۔ ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور۔۔۔ اور یہ سچ ہے۔ کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں دوڑائی تھی اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو، جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا، پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس لیے پسند کرتا تھا کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس کے دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ نِکی کو یقین تھا کہ وہ اس بے فکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی، البتّہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی اور شاید اسی لیے وہ اس کے متعلّق اپنے تخیّل کو محبّت کی آلودگی سے علاحدہ رکھنا چاہتی تھی، وگرنہ اس کے لیے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بُکنگ آفس کے

سامنے، ہاؤس فل کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر خود جا بیٹھتی۔

بر آمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا، اس لیے نوجوان کے کپڑے کسی قدر آلودہ ہو گئے۔ لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا، گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کیے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا، جو کہ دائیں دیوار سے ہٹا کر منیجر کے کمرہ کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا، جہاں سے وہ اٹھالی گئی تھی۔ بُکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے، لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لیے اسے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گزارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے تھے۔ وہ دن، جب کہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب۔۔۔ کلکتہ کے سے مہذّب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بُکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوانوں کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اسے چونّی ملتی تھی۔ اس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ دور نوجوان کو بُکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا، جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو۔

چھبیس۔۔۔ ستائیس۔۔۔ تیس۔ چوتھی قطار۔۔۔ بارہ۔۔۔

بُکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جار کیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لیے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تو تھی۔۔۔ مسز دسوزا۔۔۔ اخّاہ! اس کے ساتھ مسٹر دسوزا نہیں تھے۔ وہ تھے یا نہیں تھے، بُکی ہلکی ہلکی سر درد میں بالکل بھول چکی تھی۔ اسے تو ان کی شکل تک یاد نہ رہی تھی۔ بکی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ اس چونّی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لیے ملتی تھی۔

"جنٹلمین" بُکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کی سیٹ

چوتھی لائن میں تیرہ پر رکھی ہے اور بارہ پر مس دسوزا کی جگہ ہے اور بُکی نے جان بوجھ کر مسز کو مس کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا، اور پھر بُکی کو اپنی چونّی عزیز تھی۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبّت تھی اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔

نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ'' اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

بکی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر پلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ ایش ٹرے کو اپنے نزدیک سِرکا رہی تھی تو ایک بدصورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بُکی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کمسن تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا، البتہ جاننا چاہتا تھا۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا، جو کہ اس کے چہرے کے بھدّے نقوش کو اور بھدّا بنا رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونّی بُکی کی طرف سِرکا دی۔ بُکی کا

منہ کھلا رہ گیا۔ ''تم چاہتے ہو۔۔۔'' وہ بولی اور چونّی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھ لیا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے پلین پر جھک گئی۔

ہاؤس فل تھا۔ صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لیے پہلے بُک کی تھی، لیکن ساتھ کی سیٹ میں لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ بُکی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہو گی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ لڑکی۔۔۔ وہ بلانڈ، اور اس کے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں، جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی ہو۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لیے بنائے تھے۔ اس کے پہلو میں اس بے وقوف، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا، اس لڑکی کی توہین کرنا تھا اور یہ چھوکرا نو آموز ہی نہیں تھا، بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے، اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ وہ گدھا تو اصلی ستاروں کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کاٹتا اٹھ کر کلکتہ چلا آیا تھا۔

نوجوانوں کا ایک غول اس کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ لیکن سب نشستیں رُک چکی تھیں۔ پلین سارے کا سارا نُکی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے، اور وہ نوجوان اپنے اوور کوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے۔

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد مون سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایگزٹ کی طرف آ کھڑی ہوئیں۔ ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت نُکی کے دل میں اس دیہاتی نوجوان کے لیے ایک عجیب، مادرانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے، ہاؤس فل کا تختہ لٹکا دیا اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دے دیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی۔ مسلسل کانپتے رہنے سے اس

چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا۔ بُکی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ بُکی نے سوچا شاید وہ لڑکی بھی میری طرح ربط و حسن کی بجائے اپنی چونّی یا دس کے نوٹ کو پسند کرتی ہو۔ اس کے بعد پردے چھٹ گئے اور سینما شروع ہوا۔ انگریزی فلم "میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے" شروع ہوئی اور گانا ایک دلفریب ٹیون پر گایا جانے لگا۔

تاروں بھری رات کے نیچے

بُکی نے ایک گہرا، ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے۔ لیکن ابھی دوسرے شو کا پلین بنانا تھا اور اسے تین ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کو شدّت کی روشنی سے بچانے کے لیے اسے ہال کا اندھیرا پسند تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے کا دلفریب گانا سن کر اس بدصورت نوجوان کو کیا

خوبصورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا، یا ہال کی چھت؟ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے؟ اس کے بعد بُکی باہر نکل آئی۔ کنڈکٹر جانتا تھا کہ بُکی، اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لیے پکچر دیکھا کرتی ہے اور پھر فوراً ہی مُضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردۂ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جا رہا ہو۔ حالاں کہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا چھلکتا ہوا دل لے کر باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اسے یاد آجاتا، جہاں اس کی محبّت پروان چڑھی اور لٹ گئی۔ جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا ابھر کر چلی آتی تھیں۔ اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی۔ اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گائے کے گوبر کو مٹّی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور بُکی کا جی بھی چاہتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علاحدہ کونے میں صبر و سکون سے پڑ رہے اور ان ہی عورتوں کی طرح

چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کرے۔

وہ منیجر کے کمرہ کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی۔ کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی۔ ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ بُکی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور اس کے ساتھ کی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لیے ویسے ہی اجنبی تھے اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوبصورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ لیکن وہ تو گُم صم بیٹھا تھا۔

اب ہاف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا۔ لیکن وہ باہر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بہت اُترا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا اور اپنے لبوں پر بے تحاشہ زبان پھیرتا اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

”ہلو مس۔۔۔مام“ اس نے باہر نکل کر ڈرتے ہوئے کہا۔

بُکی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی ”ہلو۔۔۔ بوائے، انجائیڈ آلرائیٹ (کہو، خوب لطف رہانا؟)“

اس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا"مام۔۔۔ میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور۔۔۔ اور۔۔۔" اس کے بعد وہ ہکلانے لگا۔ "میرا چچا کدار پور میں دکان کرتا ہے۔"

بُکی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا اور بکی بھی یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اس کے بعد جب شو ختم ہوا تو بُکی نے منیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی، بدصورت نوجوان باہر آیا۔ بُکی اس کے قریب چلی گئی، بولی۔

"ہلو بوائے۔ تم کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہرش پور۔ ۲۴ پرگنہ کا"۔

"میں جانتی ہوں ہرش پور میں ایک دفعہ مسٹر رے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی۔"

"رے؟ ہاں ہاں "لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا" میں رے کو جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا۔ "آپ اتنی مہربان ہیں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"نلنی" نکی بولی۔ "لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا۔ اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی میری ماں ہے اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتا ہے؟"

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی۔ "چلو ہم کافی کی ایک پیالی پئیں گے۔"

اور وہ دونوں 'فرپو' کی طرف چل دیے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا بلب دور سے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے۔" نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔

بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دودھ کے مٹکے چڑھا جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا۔ لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے۔ مارگریٹ پوچھتی۔

"یہ کیا ہے؟"

"نامعلوم"

"ساسیج۔۔۔ کہو ساسیج"

"ساسیج"

"یہ کیا ہے"

"نامعلوم"

کٹلٹس۔۔۔ کہو کٹلٹس"

"کٹلٹس"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا، تو مارگریٹ اسے درست کرتی۔ جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نئے نام لینے سکھاتی ہے، اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے تو اسے درست کرتی ہے۔ کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن اس لڑکے نے تھام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دیے۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہو گا، لیکن اس نے دیکھا کہ وہ اس بات سے تو واقف تھا۔ ایسے ہی جیسے سینما میں چونّی زیادہ دے کر عورت کے ساتھ سیٹ بُک کروا لینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر یا کھانا کھا کر اس کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہو گا۔

مارگریٹ نے بتایا۔ کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے۔ جب یہ بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بُو آنے لگتی ہے اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلّق بالکل کچھ نہیں جانتا، تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”بوائے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے؟ میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علاحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔ میں تمھیں بتا دوں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا، یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا، یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے۔۔۔ہاں، تم اس عورت کو دیکھ لو گے، وہ عورت جو کلکتہ ہے۔“

# اغوا

"آلی۔۔۔ آلی۔۔۔" دلاور سنگھ نے زور سے پکارا۔

آلی۔۔۔ علی جو، ہمارے ٹھیکے کا کشمیری مزدور تھا۔ منشی دلاور سنگھ کی آواز سن کر علی جو ایک پل کے لیے رکا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ابھی تک لیموں کی طرح ترش تھیں اور علی جو کی سرخ رگوں سے بھری ہوئی آنکھوں نے انہیں چکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ منشی جی کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر علی جو نے نل کا رسہ تھام کر بقیہ چرخی کو گھومنے سے روک دیا اور جواباً بلند آواز سے بولا۔۔۔ "ہو

سر دار"!

سر دار خاموش اور کم گو آدمی تھا۔ آج اس کا خلاف معمول اونچی، پر جوش آواز سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ کنسو اپنے آبائی گاؤں، جنڈیالہ گورو سے واپس آ گئی ہے۔ دراصل ٹھیکے پر کام بدھ اور جمعرات کو اس لیے بھی سست رہا کہ کنسو، رائے صاحب، اپنے باپ کے ساتھ شہر سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد بنگلے کی فضا ایک ساکن اور گدلے پانی والے جوہڑ کی طرح ہو گئی تھی۔ لیکن اب کنسو کے آتے ہی ہمیشہ کی طرح ٹھیکہ بٹ گیا۔ دو حصّوں میں۔۔۔ کام کرنے والوں میں اور گھورنے والوں میں۔ کام کرنے والے اس کی موجودگی میں زیادہ مستعدی سے کام کرتے تھے اور نکمّوں کی کسر پوری کر دیتے تھے۔ مزدوروں کے سربراہ منشی جی تھے۔ ان کے چھوٹے سے دستے میں علی جو، رحمان جو، گنی (غنی) اور علیا وغیرہ شامل تھے، اور یا پھر ہئی سا، ہئی سا۔۔۔ مال ملے گا، ہئی سا کی رٹ لگانے والے بھّین۔۔۔ 'پوربّین'۔ ان لوگوں کے جسم میں کنسو کو دیکھتے ہی ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ دوسری طرف گھورنے والوں میں مزدوروں اور کاریگروں کے علاوہ بابو قسم کے لوگ تھے۔۔۔ جھوٹ کیوں کہوں۔۔۔ ان میں، میں بھی شامل

تھا اور ان دنوں ٹھیکے کی چھوٹی موٹی 'بک کیپنگ' کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ دلال تھے، مختار تھے اور شیخ جی تھے۔

یہ شیخ جی ساٹھ کے تھے۔ لیکن تھے بڑے کائیاں۔ انہیں زلف پہ شب دیجور کی پھبتی سوجھا کرتی تھی۔ زندگی کو تو شیخ جی نے بس پی لیا تھا، لیکن بقول دلاور سنگھ ابھی "ٹھوٹھا" ہاتھ میں تھا۔ یعنی تھے کاسہ بدست۔ کئی مکمل اور نامکمل رومان ان کے ذہن کی انتڑیوں میں تپ محرقہ پیدا کر رہے تھے۔ شیخ جی عموماً بات یوں شروع کرتے "جب ہم جوان تھے۔۔۔"

اس کے بعد شیخ جی کی شنوائی نہ ہوتی۔ ہر ایک اپنی جوانی میں مست تھا۔ کم و بیش ہر ایک کی جوانی شیخ جی کی رجعت پسند جوانی سے زیادہ رنگین تھی اور اسے اس پر بجا یا بے جا طور پر ناز تھا۔

چنانچہ "جب ہم جوان تھے۔۔۔" کے ساتھ ہی ایک ہلڑ سا مچ جاتا۔۔۔

کبھی شیخ جی بھی جوان تھے؟

پرانی ہو گئی اب شیخ جی کی جوانی۔۔۔

اوبے، بکتا کیوں اے۔۔۔اے چپ رَو، بے ایمان گنی!

اور جب آوے گدھی پر جوانی۔۔۔

قہ قہ قہ !!!

کنسو کو بھی شیخ جی سے بے حد عقیدت تھی۔ دراصل کنسو کو ٹھیکے کے ہر آدمی سے انس تھا۔ وہ ایک پھرکی کی طرح گھومتی ہوئی آتی اور کاریگروں، مزدوروں کے اس ہلڑ میں گھومتی پھرتی، فقرے چست کرتی نکل جاتی۔ بڑی ہی جان تھی اس پھرکی میں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہت ہی طاقتور ہاتھ کی چٹکی نے اسے گھما کر وقت اور مقام کی وسعتوں میں ہمیشہ ہمیشہ آوارہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، اور یہ پھرکی اسی گت سے رہتی دنیا تک گھومتی رہے گی اور کبھی دم نہ لے گی۔ آپ ابھی کنسو سے باتیں کر رہے ہیں اور مارے شرم کے اپنی علی جو آنکھیں کنسو کے چہرے پر نہیں گاڑ سکتے۔ آپ برمے کمانچے سے ساگوان یا دیودار میں سوراخ کیے جاتے ہیں اور پھونکیں مار مار کر بُرادے کو پرے اڑاتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا جی چاہتا ہے کہ ایک پَل، ایک چھن اپنے حسین مخاطب کو دیکھ لیں۔ آپ ذرا گردن پھیرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ کنسو غائب ہے۔۔۔ غائب!

ہمارے ہاں ایک پہیلی ہے۔۔۔ یہ تھی، وہ گئی۔ اس کا حل ہے نگاہ، اور ظاہر ہے نگاہ کتنی تیز اور دور رس ہوتی ہے، جو دل وجود کو بھی چیر جاتی ہے اور جس سے آپ اپنا آپ بھی نہیں چھپا سکتے۔ ابھی وہ یہاں برے کمانچے اور ساگوانی بُرادے میں الجھی ہوئی ہے اور اگلے ہی لمحے وہ اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں اور جہاں درختوں کے زمردیں طاؤس اس ملاپ کی خوشی میں پائل ڈالے، اپنے بھدے اور کریہہ پاؤں زمین کی گولائیوں میں چھپائے ناچتے نظر آتے ہیں۔ جہاں آپ کا جسم بھی جانا چاہتا ہے، لیکن جا نہیں سکتا کیونکہ جہاں سلطان خلوت کرتا ہے، وہاں حشم نامحرم ہوتا ہے۔ جس جگہ جان پہنچتی ہے وہاں تن باریاب نہیں ہوتا۔ کاریگروں کی سہیلی کنسو بھی ایک پہیلی تھی۔ پلک جھپکنے میں وہ اپنے خلوت خانوں میں گم ہو جاتی اور گنی ونی، علیا، علی جو اور ہئی سا، ہئی سا کا لاؤ لشکر منہ اٹھا کر دیکھتا رہ جاتا۔ اگرچہ رائے صاحب نے اسے بہت آزادی دے رکھی تھی، پھر بھی وہ اپنی اس لاڈلی 'یہ تھی، وہ گئی' سے بہت، بہت نالاں تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن نیا نیا آباد ہوا تھا۔ قطعے بک چکے تھے لیکن تعمیر شروع نہیں

ہوئی تھی۔ ہر خریدار میں پہلے تم کو دو کا جذبہ تھا اور رائے صاحب نے پہل کی تھی۔ زیر تعمیر بنگلے کے ساتھ اس بلاک میں صرف ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی، جس میں رائے صاحب شہر سے اٹھ آئے تھے۔ کھلی آب و ہوا میں رہنے کا خیال آتے ہی رائے صاحب کا شہر میں تعفّن سے دم گھٹنے لگا اور وہ اس کوٹھی میں پدھار کر بڑی بے صبری سے بنگلے میں پرویش کا انتظار کر رہے تھے۔ جتھ کے لیے شہر کے رؤسا کی ایک لمبی چوڑی فہرست میں ہر روز ترامیم ہوتی تھیں۔ ان دنوں کوبے، جاپان میں بھونچال آیا تھا اور رائے صاحب اس کی خبریں پڑھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ بس اسی کوٹھی کے سوا دور تک کوئی مکان نہ تھا۔ کئی ایک ایکڑ زمین میں لونک بوٹی اگ رہی تھی۔ مجھ سے ازلی مجرد ٹھیکے پر ہی سو جاتے تھے۔ شیخ جی بھی وہیں سویا کرتے۔ ان کی بیوی وفات پا گئی تھی۔

شیخ اور شیخانی کی زندگی بھر نہیں بنی، کیونکہ شیخ جی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شیخانی میری گردن کے نیچے بازو رکھ کر سویا کرتی تھی اور میں نے اس کی گردن کے نیچے کبھی بازو نہیں رکھا تھا۔ اور پھر کنسو کو شیخانی کی وفاداری کے قصّے سنایا کرتے تھے۔ کنسو ہر ایک کی دکھتی رگ سے واقف تھی۔ شیخ جی سے باتیں کرتی تو 'بے چاری'

شیخانی کے متعلق۔ مجھ سے بات کرتی تو میری شادی کی ناممکن ممکنات پر اور میری ہوائی بیوی کی شکل کے متعلق۔ جسے وہ بھابی کہہ کر میرے دل میں ہمیشہ ایک گدگدی پیدا کر دیا کرتی، اور علی جو سے بات کرتی تو کشمیر کے رومانی مناظر اور فروں کی تجارت کے متعلق۔ علی جو در حقیقت مزدور نہیں تھا، لیکن نامساعد حالات اور فروں کی تجارت کی تباہی نے اسے اس کام کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اب بھی جب کبھی بارش کے بعد فضا کے خاکی ذرات دھل جاتے، تو اسے ماڈل ٹاؤن میں پہاڑ دکھائی دینے لگتے۔ اور کنسو جانتی تھی کہ ہر ایک کا چور دروازہ ہوتا ہے اور وہ اس چور دروازے سے بلا کسی آہٹ کے داخل ہو جاتی اور اندر سے سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے آتی۔ ہم تین چار لوگوں کے سواڈیرے میں تین چار، پوربین 'بھین' تھے جو اپنی 'لگائین' کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے عارضی طور پر اینٹوں کی کئی بے ترتیب کوٹھڑیاں بناڈالی تھیں اور ماڈل ٹاؤن کے اندر ایک اور ماڈل ٹاؤن آباد کر دیا تھا۔ بلا کی عورتیں تھیں۔ ان کی لگائین کڑاکے کی سردی میں صرف ایک انگیا یا ایک معمولی سی صدری پہن لیتی تھیں اور چالیس مکعب مکعب فٹ روڑی کوٹ ڈالتیں۔ ان کا دودھ بچے پیتے تھے، لہو

ٹھیکیدار پیتا تھا اور ہڈیاں خاوند چچوڑتے تھے۔

بھلا ہو ٹھیکیدار کا جس نے ہمیں ساگوانی برادہ تک جلانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اگرچہ آگ ان دنوں افیم کے بھاؤ بکتی تھی۔ سنو سنگھ سردار بگھیلا رائے جی، پالا پوس نہ پالا ماگھ۔۔۔ پالا ٹھنڈی وائے جی۔۔۔ یہ کہاوت ہمیں شیخ جی سنایا کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ٹھنڈک صرف ہوا سے پیدا ہوتی ہے۔ کہیں دور چھٹانک چھٹانک کے اولے پڑے تھے۔ شیخ جی نے حجامت کے لیے شہر جانا ملتوی کر دیا اور لگے ابر آلود آسمان کی طرف تکنے اور سر پر ہاتھ پھیر کر 'اللہ خیر' کا وظیفہ پڑھنے۔ کوٹھی میں رائے صاحب کی بوری بھینس نے ناند کے ساتھ جسم رگڑ کر جھول گرا دی تھی۔ شیخ جی جھول کو اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ ہمارے پاس آئے۔ آج انھوں نے ایک نئی چیز دریافت کر لی تھی اور وہ یہ کہ لاہور میں رہنے والے لوگ لاہور ہی میں لوگوں کو چٹھیاں ڈالتے ہیں۔ کتنا بڑا شہر ہے لاہور۔۔۔ شیخ جی کی اس دریافت پر مجھے بہت ہنسی آئی۔ لیکن میں بدستور حساب کتاب میں منہمک رہا اور شیخ جی کی پھبتی کے متعلق سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد شیخ جی دہکتے ہوئے بُرادے کے قریب آ گئے اور کچھوے کی طرح جھول میں سے

گردن نکال کر بولے، ”کنسو بہت ہی جوان ہو گئی ہے۔“

اب یہ بات بھی لاہور کے ایک بڑا شہر ہونے کی طرح ایک ’دریافت‘ تھی۔ لیکن کنسو کا نام سنتے ہی علی جو، رحمان جو، اور گنی ونی کے کان کھڑے ہو گئے۔ دراصل لاہور کی تمہید اسی بم کے گولے کے لیے تھی۔ لیکن تمہید اور حرف مطلب میں اتنی بے تعلقی تھی کہ لاہور کی چھٹیوں کے بعد بے وقوف طبقہ کے سب آدمی اسے ضمنی بات سمجھ سکتے تھے۔

تین چار آدمیوں کو اکٹھے ہوتے دیکھ کر کاریگروں نے بھی اڈوں پر دم لیا اور ادھر چلے آئے۔ دلاور سنگھ نے پھر نل پر بلانے کے لیے دور سے پکارا ”۔۔۔ آلی۔۔۔ آلی۔۔۔ رحمے“ اور اس کے بعد خشت درجہ اوّل کی تمام پرچیاں اٹھائے شیخ جی کو طنزیہ سلام جگانے خود بھی ادھر چلا آیا۔ جمعدار رام آسرے نے بھی زندگی بھر نہ ٹوٹنے والے بیکانیری جوتے سرکائے اور قریب آ گیا۔ علی جو نے اپنے کشادہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر گدھ کی طرح ایک لمبی اور بے ڈھنگی سی قلانچ بھری اور گنی کو اپنے پروں کی لپیٹ میں لے لیا۔ گنی بولا۔ پرے ہٹ ہاتو۔ علی جو لفظ ہاتو سے بہت جلتا تھا۔ کیونکہ ٹھیٹ پنجابی اصطلاح میں ہاتو بوجھ اٹھانے والے کشمیری کو کہا

جاتا ہے اور علی جو کوئی لدو جانور تھوڑے ہی تھا۔ علی جو نہ تو مزدور تھا اور نہ ہی مالک۔ وہ تو خوبصورت لفظوں میں لکھا ہوا ایک المیہ ڈراما تھا جو فروں کی تباہی پر ختم ہوتا تھا۔ علی جو کا جسم ترکستانیوں کی طرح سڈول اور تنومند تھا۔ ادھر پنجاب میں مختلف کام کر کے اس نے اچھے پیسے جمع کر لیے تھے اور اب وہ بارہ مولہ پہنچ کر اپنی زندگی کا سفید جُبّہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی جو نے گنی کو پٹخنی دی۔ مارنے والے نے مارا، سہنے والے نے سہ لیا۔ بات جاری رہی جو مارنے اور سہنے سے زیادہ دلچسپ تھی۔ دلاور سنگھ بولا،

”بدمعاش ہے سالی۔“ علیا بولا، ”گجب خدا کا، اسے روکتا بھی کوئی نہیں۔ کئی دفعہ تو بڑی ہی دیر سے گھر آتی ہے۔ جب ہم شام کو گھر جاتے ہیں تو اس کا تانگہ ہمیں نہر پہ ملتا ہے۔“

”خبر نہیں کتنے یار رکھے وے ہیں اس چھوکری نے۔“

”مجھے تو بھاگتی دکھے۔“

”کس کے ساتھ دکھے بھاگتی؟“

”جو بھی کوئی لے جائے۔۔۔جو انی آفت پہ آئی دی ہے۔“

اور سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ کنسو بھاگ جانا چاہتی ہے۔ سب اپنا اپنا تصوّر چمکانے لگے۔ شیخ جی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے ”تم سب گلت کہتے ہو۔ وہ نہیں بھاگے گی۔ کم سے کم میرا تو سو بسوے یہی کھیال ہے۔“

کنسو کے طور اطوار سے تو مجھے بھی یہی شک ہوتا تھا کہ وہ چلن کی اچھی نہیں اور اسے کوئی بھی بھگا کر لے جا سکتا ہے۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو، شیخ؟“ میں نے معاً سوال کیا۔

”کم سے کم ان دنوں تو اس کی باتوں سے مجھے کوئی سک نہیں ہوتا۔“

”کیسے؟“

”جانتا ہوں۔۔۔ بس کہہ جو دیا۔“ شیخ نے سر ہلاتے ہوئے ایک بے معنی سا جواب دیا۔ سورج کی شعاعوں میں اس وقت تک شکنجبین کی سی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی اور علی جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ جی کے منہ کی طرف دیکھ سکتا تھا اور سوچ سکتا تھا۔ اتنی بھی کیا ٹھنڈک لگ رہی ہے شیخ کو، سالا بھینس کی ہی جھول لپیٹ چلا

آیا۔ گنی اس وقت کچھوؤں کا شکاری معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کا جی چاہتا تھا کہ جھول میں سے نکلی ہوئی گردن کو پکڑ کر مروڑ ڈالے۔ کنسو سچ مچ تھوڑے ہی بھاگ چلی تھی۔ ذرا ایسی باتوں سے مزا ہی لے لیتے۔ شیخ جی کی اس بے دلیل قطعیت۔۔۔بس کہہ جو دیا، پر مجھے بھی غصہ آرہا تھا۔ کائیں، کائیں، کائیں۔ آسمان کے آخری کوّے چھانگے مانگے کے جنگل کی طرف جارہے تھے اور اپنے پیچھے آوازوں کی غیر مرئی لکیریں چھوڑتے جاتے تھے۔

"یے بوبا" جمعدار رام آسرے کی بیوی رام دئی نے آواز دی اور جب رام آسرے نہ ہلا تو ٹوکری کو پھٹوں میں رکھ کر سَر کے انو کو اس میں پھینک دیا اور آپ کولہے مٹکاتی ہوئی اپنے ماڈل ٹاؤن کی طرف چلی گئی۔ دلاور سنگھ خشت درجہ اوّل کی پرچیوں کو میرے تخت پوش کے صندوقچے میں بند کرکے تالا لگاتے ہوئے بولا۔ "آج شیخ جی نے ہری تریاں (بھنگ) پی لی ہیں۔"

"ہنکارے ہے بڈھا تو" پوربیا بولا۔

عجیب بات تھی۔ سب کنسو کا بھاگ جانا پسند کرتے تھے۔ میں نے مزدوروں کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "بابا! اماں باوا کی اتنی بے پروائی رنگ تو لائے گی ہی۔ یہ

جتنی کھل کھیلنے والی چھوکریاں ہوتی ہیں، یہ سب بدمعاش ہوتی ہیں۔" لیکن اندر ہی اندر میں شیخ جی کے تجربہ کا قائل تھا۔ عموماً بُڈھے لوگ لڑکیوں کو آزاد دیکھ کر اس قسم کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بڈھا اس کے برعکس باتیں کر رہا تھا اور پھر اس نے اتنی قطعیت سے اعلان کیا۔ آخر جب دلاور نے مجبور کیا تو شیخ شروع ہوا۔ "دیکھو سردار، جب ہم جوان۔۔۔"

کائیں، کائیں، کائیں۔۔۔ زمین کے آخری کووں نے شور مچا دیا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سندر سنگھ ترکھان نے اوزار بوری میں ڈالے اور ہو ہو ہو کہتا رام آسرے پر گر پڑا۔ رام آسرے کی پچاس گز لمبی پگڑی کھل کر گلے میں جا پڑی۔ اس نے ترکھان کی پگڑی اچھال دی۔ سردار کا جونڈا کھل کر ہوا میں لہرانے لگا۔۔۔ چلو گھر چلیں۔ شیخ پھر سے جوان ہو رہا ہے۔۔۔ راستہ چھوڑ دو وگرنہ زخمی ہو جاؤ گے۔۔۔ آلی۔۔۔ آلی۔۔۔ علی جو کی بے آواز ہنسی سے صرف فئی۔۔۔ فئی کی آوازیں آئیں۔ اولے نہیں پڑیں گے شیخ جی۔ بناسک حجامت بنوا لیں۔۔۔ کوئی بولا اور سب اپنے اپنے چھانگے مانگے کو پدھارے۔

اس وقت اندھیرا میدان اور لونک بوٹی پر رینگ رہا تھا۔ دور ایروڈرام میں ایک

ہوائی جہاز اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی دم کا چمکتا ہوا نقطہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح تیزی سے زمین کی طرف آ رہا تھا۔ اس ٹوٹتے ہوئے ستارے کو دیکھ کر اندرونی ماڈل ٹاؤن سے رام دئی یا اس کی کوئی بہن بولی۔۔۔ رام رام۔۔۔ رام رام۔۔۔ میں سوچنے لگا۔ آج مجھے شب بھر نیند نہیں آئے گی۔ باتوں باتوں میں ان سالوں نے آج کیا پٹاخا چھوڑ دیا۔ کیا کنسو کی شکل اس کی ہوائی بھابی کی شکل سے تو نہیں ملتی؟ اور میری رگوں میں خون کا دورہ تیز ہو گیا۔ میں نے کہا اب میں متواتر دودھ نہیں پیا کروں گا۔ اس سے میرے جسم میں بہت ہی جان آ جاتی ہے۔ پھر مجھے ہنسی آنے لگی۔ ہی ہی ہی۔۔۔

صبح اٹھ کر میں نے پاجامہ بدلا۔ بہت گندہ ہو چکا تھا پاجامہ، اور قمیص بھی میلی ہو رہی تھی۔ ابھی بمشکل دس ہی بجے ہوں گے کہ کنسو پھر گھومتی پھرتی آئی اور شیخ جی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی پاکیزگی کی طرح سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن میں نے سوچا کہ ان کپڑوں کے اندر سفیدی کی بجائے سرخی ہے۔ گرم گرم لہو کی سرخی۔ کنسو کے بالوں اور دوپٹے کی متوازی لکیریں اپنی چمکتی ہوئی سیاہیوں اور سفیدیوں کے ساتھ بے پروایانہ انداز سے پشت کی

پگڈنڈیوں اور شاہراہوں پر رواں دواں تھیں۔

شیخ جی نے پوچھا۔ "جنڈیالے سے کب آئیں تھیں تم، بیٹی؟"

"کل ہی تو آئی تھی بابا۔۔۔" کنسو بولی "جنڈیالے میں میرا چچا مر گیا تھا بابا۔ بات سناؤں تمھیں اس چچا کی، بے چارہ اسٹیشن ماسٹر تھا۔"

شیخ جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرا داماد اسٹیشن ماسٹر ہے۔"

کنسو نے میری طرف دیکھا۔ شیخ جی کے خلاف میری اور کنسو کی سازش تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چونے کی کھڑی گاڑیاں۔۔۔ بہتر روپے آٹھ آنے۔۔۔"

"کنسو نے کہا۔ "میری بات تو سنو، بابا۔"

بابا سننے لگا۔۔۔ "ساری عمر لاہور میں رہا بے چارہ۔ وہیں کالجوں اسکولوں میں لڑکے پڑھتے تھے۔ دو برس ہوئے چچی مر گئیں۔ شیخانی کی طرح۔ لیکن وہ بچوں کے ساتھ دل بہلا لیتے تھے۔ اس کے بعد تبدیلی ہو گئی۔ شور کوٹ روڈ، وہاں کوارٹر ملا تو اتنا بڑا کہ چار کنبے رہ جائیں۔ رات کو مکان بھائیں بھائیں کرتا۔ اس میں

چاچا اکیلے ٹانگیں پسارے پڑے رہتے۔ لیکن وہ زندگی بھر اکیلے نہ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی شادی کے بعد بہو کو رونق کے لیے لے گئے۔ بھابی کو شور کوٹ والوں نے سر پر اٹھالیا۔ بڑے بابو کی بہو، بڑے بابو کی بہو۔۔۔ بہو کو آئے مہینہ بھر نہ ہو پایا تھا کہ بیٹے صاحب آ دھمکے۔ اب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور پھر تم جانتے ہو، روٹی کی کتنی تکلیف ہو جاتی ہے۔ بہو بھی اتاولی سی تھی۔ ٹرنک وغیرہ اٹھوا چلی گئی۔ چچا بہت روئے، بہت روئے۔۔۔ خط میں لکھتے ہیں بیٹے کو۔ بہو کے آ جانے سے مجھے تمہاری ماں کے دن معلوم ہونے لگے تھے۔ وہی رونق، وہی۔۔۔ لیکن، لیکن تمہارے ہاں تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے جس کی بہو تم لے آؤ۔۔۔"

شیخ جی بولے۔ "بیٹا!۔۔۔ میں بھی زندگی بھر اکیلا نہیں رہا۔ اب یہاں ٹھیکے پر ٹانگیں پسار کر سوتا ہوں تو ساری دنیا بھائیں بھائیں کرتی نظر آتی ہے۔ شیخانی کے دم سے بڑی رونق تھی۔ وہ یوں تو غریب تھی لیکن نیّت کی بہت امیر تھی شیخانی۔۔۔ یہ کون ہے۔۔۔ یہ داماد آ رہا ہے؟ یہ کون ہے، اس کے پچیرے بھائی کی بی بی ہے، یہ کون ہے رجالی کی بیوہ ہے۔۔۔ ابھی چائے بن رہی ہے، ابھی اخروٹ منگوائے جا رہے ہیں۔ ابھی دھنیے نے چار لحاف تیار کر دیے ہیں اور میں

کماتا اور کھپتا مر جاتا۔ اب میں کس کے لیے کماتا ہوں۔ کس کے لیے کھپتا ہوں۔ اب میرا کون ہے۔۔۔؟

اور شیخ جی کا گلا رندھ گیا۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا جو دکھ بھرے دل سے یہ کہے کہ اس سنسار میں میرا کون ہے؟ اور پھر اس سے آگے کچھ کہہ پائے۔ اتنا بدنصیب کم ہی ہوتا ہے کوئی۔ اگر شور کوٹ میں اس کا کوئی نہ ہو، تو لاہور میں ہوتا ہے۔ لاہور میں نہ ہو، تو ماڈل ٹاؤن میں۔۔۔ لیکن شیخ جی کا تو چھانگے مانگے میں بھی کوئی نہ تھا۔

کنسو شیخ جی کو رلا کر ٹل گئی اور میرے قریب آ کر بولی۔ ''دراصل بات یہ ہے، میرا کوئی چچا وچا نہیں ہے۔''

اور اڈے کے پاس ابھی تک شیخ اپنی پگڑی کے شملے سے آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد کنسو بولی۔ ''میں نے جنڈیالے میں بھابی پسند کر لی ہے۔'' میں نے کنسو کے تل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! اس کے بائیں گال پر تل ہے۔ وہ رات کو خواب میں میرا سب مال و متاع لوٹ کر لے گئی۔'' کنسو نے مجھ پر برادہ اچھال دیا۔ کوٹھی سے آواز آئی۔ ''کنسو!'' کنسو کی

نانی کی آواز تھی جو ہمیشہ کنسو سے بے سود التجا کیا کرتی کہ کنسو اپنے دوپٹے سے سر ڈھانپ لے۔

اس کے بعد کنسو علی جو کی طرف مخاطب ہوئی۔ علی جو اس وقت نل کے رسہ کو چھوڑا چاہتا تھا۔ "ہو سردار" اس نے منشی جی کو بلاتے ہوئے شکستہ پنجابی میں کہا۔ "اب کتنا چلا گیا اندر؟"

نل پندرہ فٹ کے قریب زمین میں جا چکا تھا۔ دلاور بولا۔ "ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ زمین کچھ پتھریلی ہے۔ کڑ بہت محنت سے ٹوٹے گا۔"

زمین کے اندر سے بہت سے چھوٹے چھوٹے سفید پتھر باہر آرہے تھے۔ علی جو رسے کو کھینچتا تو اس کے پٹھے تن جاتے تھے۔ کنسو بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی رہی اور علی جو کے تنومند جسم کو دیکھتی رہی۔ علی جو اس وقت سورج کی پہلی کرنوں میں تمتمارہا تھا۔ نوزائیدہ بچے کی طرح وہ سر سے پاؤں تک خون کا ایک بڑا سا قطرہ دکھائی دیتا تھا۔ ٹوپی کے باہر اس کے بالوں کی سرخ، گھنگھریالی اون کے کنارے سنہری ہو رہے تھے۔ چھاتی پر اڑے ہوئے چیتھڑوں میں سے اس کا نصف، تنا ہوا سینہ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ کنسو نے بغلوں میں ہاتھ دے لیے

اور دیکھتی رہی۔

دیکھتی رہی۔ پھر علی جو سے بولی، ”ارے ہاتو! بارہ مولے کب جا رہے ہو؟“

”جد پیسئے ہو جاندیس (جب پیسے ہو جائیں گے)“

”جو پیسے میں دے دیندیس (اور جو پیسے میں دے دوں تو؟)“

”آ بھی، ہونے جاندیس (ابھی اسی وقت چلا جاؤں گا)“

علی جو نے ہاتو کے لفظ کا برا نہیں منایا۔ کنسو چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آتی اور ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتی۔ ٹھیکہ بٹتا رہا۔ ہم بھی شیخ جی کے نقطہ نگاہ کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے۔ کنسو، بہت آزاد لڑکی ہے وہ یونہی ہر ایک سے ہنس کھیل لیتی ہے۔

اس وقت عمارت کھڑکیوں کی کارنس تک پہنچ چکی تھی۔ ہمارا عملہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ کارنسوں سے دور دے اوپر اٹھنے پر ایک خوش پوش نوجوان کسی الیکٹریشن کا بورڈ لے آیا اور اسے بلاک کے ساتھ والی سڑک کے کنارے شیشم کی چھاؤں اور ارنڈوں کے سامنے گاڑ دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”الکٹرک انسٹالیشن بائی راج اینڈ

کمپنی" اس کے بعد تاروں کے گورکھ دھندے، گڈیاں اور سفید سفید کٹ آوٹ آنے لگے۔

ایک دن پھر شیخ جی میرے پاس آئے۔ آج پھر انہوں نے بھینس کی جھول لپیٹ رکھی تھی۔ جب وہ کبھی بہت رازدارانہ لہجے میں بات کرنا چاہتے تھے تو وہ بھینس کی جھول لپیٹ لیتے تھے۔ میرے پاس آتے ہی بولے۔

"اب کنسو بھاگ جائے گی۔"

میں نے کہا "ہیں؟"

"تم نے کچھ تبدیلی دیکھی ہے؟"

میں سوچنے لگا۔ میں نے کیا تبدیلی دیکھی ہے۔۔۔ کیا تبدیلی؟

"کیا تبدیلی؟" میں نے شیخ سے پوچھا۔

"بس اب دیکھنا۔"

"بتاؤ تو۔"

”بس کہہ جو دیا دیکھنا۔“

”پھر بھی۔“

”بس کہہ جو دیا میں نے۔“

میں نے سٹپٹا کر زیادہ کرید نہ کی۔ دوپہر کو جب کنسو باہر نکلی تو وہ قدرے سہمی، شرمائی ہوئی تھی۔ یوں تو اس نے ہر ایک کے ساتھ باتیں کیں، لیکن آج ان میں کچھ اکھڑا اپن سا تھا۔ دلاور سنگھ، شیخ جی، سندر سنگھ، علیا، گنی، بجلی کے مستری سبھی کے ساتھ وہ بولی۔ لیکن علی جو کے پاس سے گزر گئی۔

شیخ نے کہا۔ ”تم نے دیکھا؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں شیخ، میں نے دیکھا۔“

اس کے بعد ہم شام تک گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ شیخ جی اور میں۔ آج کا دن مبارک تھا۔ آج علی جو نے زمین کا پتھریلا کڑ توڑ ڈالا تھا اور نل، زمین میں پانی تک چلا گیا تھا۔ نلکے کے مستری نے کڑ ٹوٹنے کی خوشی میں بتاشے تقسیم کروائے۔ علی جو فارغ ہو چکا تھا اور آج رات وہ چلا جانا چاہتا تھا۔

شام کے قریب جب زمین کے کوے گھر جانے لگے، تو ہمیں رائے صاحب کی

تلاش ہوئی۔ اس وقت اڈوں کی آڑ میں سے شیخ جی نے مجھ کچھ دکھلایا۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ سامنے علی جو کھڑا تھا۔ کوٹھی کا ایک دروازہ بالکل معمولی طور پر کھلا ہوا تھا اور کنسو علی جو کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

# غلامی

آخر تینتیس سال کی طویل ملازمت کے بعد پنشن پا کر پوٹھو رام گھر پہنچا۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے اس کے منتظر تھے اور اس کی بیوی سرسوں کا تیل لیے کھڑی تھی۔ کب پوٹھو رام آئے اور وہ دہلیز پھاندنے سے پہلے چوکھٹ پر تیل گرا دے اور پھر نوبت، اپنے بڑے بیٹے کو اشارہ کرے کہ وہ پھولوں کا ہار اپنے بوڑھے باپ کے گلے میں ڈال دے۔ چنانچہ سرسوں کا تیل گرانے کے بعد ہاروں سے لدے پھندے، پوٹھو رام کے گلے میں نوبت نے بھی ایک ہار پہنا دیا۔

چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے پولھورام سوچ رہا تھا، یہ پھول کتنی دور دور سے آئے ہوں گے اور پھلیرے نے ان سب کو ایک تاگے میں پرو دیا ہو گا اور ان پھولوں کی قسمت میں بدا ہو گا کہ وہ میرے گلے کی زینت ہوں۔ میری عزّت افزائی کے لیے یکجا ہوں۔ اور دفتر میں کتنے بابو اکٹھے ہو رہے تھے۔ کوئی میانوالی کا مہتا تھا، کوئی بھمبر کا بٹ۔ گویا دور دور سے آئے ہوئے پھول تھے اور مقدر کے پھلیرے نے انہیں یکجا کر دیا تھا۔ میری زینت کے لیے، میری عزّت افزائی کے لیے۔

پولھورام کا ریٹائر ہونا بھی ایک ڈراما تھا۔ نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہ گھر آنے کے لیے سڑک پر ہو لیا تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ سبکدوش ہو چکا ہے اور اس سرمئی سیاہ سڑک پر، جس پر سینکڑوں مرتبہ دفتر کو آیا ہے، اب مہینے میں ایک بار آیا کرے گا۔ پنشن پانے کے لیے۔ فٹ پاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے اس نے پسِ پشت دفتر کی خوبصورت، گوتھک قوسوں کی طرف دیکھا۔ اسٹیپل میں بڑا کلاک بگڑا ہوا تھا۔ ''چھی!'' پولھورام نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سالا روزِ ازل ہی سے بگڑا ہوا ہے۔ کبھی ٹھیک نہیں ہوا۔ جب میں نیا نیا ڈاک کے اس محکمہ میں ملازم ہوا، تب بھی ایک گھڑی ساز گھنٹے کی سوئی کو منٹوں کی

سوئی سے نجات دلانے کے لیے کلاک تک پہنچنے والی سیڑھی پر رینگ رہا تھا۔"

سیتو نے سوچ میں مستغرق شوہر کے شانے کو چھوتے ہوئے کہا، "چھوٹی بہو آئی ہے اور بدھائی دیتی ہے۔"

پوِھو رام مسکرایا اور جذبات کی ایک لطیف رَو میں بہہ گیا "چھوٹی بہو بدھائی دیتی ہے۔ چھوٹی بہو ہئی بڑی اچھی، دونوں بڑی بہوؤں سے اچھی ہے۔ اس کی رگوں میں شرفا کا خون دوڑتا ہے۔ بڑے بیٹوں کی شادی کے وقت میں اتنا متمول ہی کہاں تھا کہ کول خاندان سے رشتہ کی توقع رکھتا۔"

اور جب سیتو نے پوِھو رام کو ہار اتار دینے کے لیے کہا تو پوِھو رام گلہری کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے ہنسا اور بولا، "ہاں، نوبت کی ماں۔۔۔ یہ بھی میری طرح اپنی نوکری سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ہی ہی۔۔۔ گویا انہیں بھی اب پنشن مل جانی چاہیے۔ ہی ہی۔۔۔"

دیے جلنے پر لال چوک کے بہت سے آدمی مبارک باد کے لیے آئے۔ پوِھو رام کے ہاں ایک کنواں تھا جس کا آدھا حصہ لال چوک میں کھلتا تھا۔ مسلمانوں اور

دلت جاتیوں کے سوا، لوگ اس میں سے باہر ہی سے پانی لے جاتے تھے۔ جب لال چوک کے آدمی آئے تو پوکھو رام کنوئیں کے اندرونی منڈیر کے پاس ایک خالی جگہ کو دھوتے ہوئے اس میں ٹھاکروں کو استھاپن کر رہا تھا۔ اب جب کہ وہ نوکری سے فارغ ہو چکا ہے، وہ صبح و شام ٹھاکروں کے سامنے کھڑ تالیں بجایا کرے گا اور برہمانند کے بھجن گائے گا۔ تینتیس برس کی طویل ملازمت میں پوجا پاٹ کی فرصت ہی کہاں تھی؟

پھر اس نے لال چوک کے آدمیوں کو بتایا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے صاحب کی دھونس نہیں سہتا تھا۔ ہارڈیکر صاحب سے تو اس کی لڑائی ہی ہو پڑی۔ اکاؤنٹ کا چھوٹا سا معاملہ تھا۔ ان دنوں وہ سلیکشن گریڈ کا پوسٹ ماسٹر تھا اور اس گریڈ کے پوسٹ ماسٹر کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔

"میں نے ہارڈیکر صاحب سے کہا۔" پوکھو رام بڑی تمکنت سے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔۔۔ "کیا آپ اس معاملہ میں دخل دے کر میری طاقتوں کو رد کر سکتے ہیں؟ پہلے تو وہ نہ مانا اور معاملہ پوسٹ ماسٹر جنرل تک جا پہنچا۔ جیت مجھی کو ہونی تھی۔ اس کے بعد وہی صاحب میرے دفتر کے معائنہ کو آیا۔ سب لوگوں کا

خیال تھا کہ اس مخاصمت کی بنا پر صاحب بہت کچھ میرے خلاف لکھے گا جس سے
میری پنشن میں فرق پڑ جائے گا اور کیا عجب جو مجھے ڈی گریڈ یا اَن فٹ ہی کر
دے۔ لیکن اس نے میری غیر معمولی تعریف کی۔ جناب یہ انگریز لوگ بہت
فراخ دل ہوتے ہیں۔ یہ بہادروں کی قدر کرنا جانتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ
پرانے کینہ جھگڑوں کو بھول جاتے ہیں۔ میں نے بچپن میں جغرافیہ یا شاید تاریخ
میں پڑھا تھا کہ انگریزی راج میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں اس کا
مطلب نہیں جانتا، تاہم میری دعا بھی یہی ہے کہ انگریزی راج میں سورج کبھی
غروب نہ ہو۔ اور دیکھیے، بخلاف اس کے کہ اگر کہیں دیسی افسر ہوتا تو نہایت
کمینگی سے پیش آتا۔ میری زندگی تباہ کر دیتا۔ ایشور کرے ان دیسی لوگوں کا
سورج کبھی طلوع نہ ہو"!

شام کو جب پولھورام کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو اس کے بیٹے، اس کی بہوویں اس
کے گرد جمع ہو گئیں۔ خدا جانے کس نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ غالباً چھوٹی بہو ہی نے
چھیڑا ہو گا۔ وہی کول خاندان کی لڑکی تھی۔ اپنی ننھی بچی کو اون کا کوٹ پہناتے
ہوئے بولی۔ "اور تو اور، میں حیران ہوتی تھی، پتا جی کیسے کڑاکے کی سردی میں

سویرے ہی نہا لیتے تھے۔ سال کے تین سو پینسٹھ میں سے ایک بھی تو ناغہ نہ ہوا۔"

پوٹھو رام انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی نوکری کا بہت پابند تھا بیٹا! اور اس تینتیس سال کے لمبے عرصے میں کوئی ہی ایسا موقع ہو گا جب کہ میں نہایا نہ ہوں اور صبح ہی نہا کر دفتر نہ چلا گیا ہوں۔ میرے سب افسر مجھ سے بہت خوش تھے۔"

دمینتی بہو بھی کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ بولی "ہم جوانوں سے تو پتا جی اچھے ہیں۔ دیکھو تو ہم اب بھی کیسے کھا پھوٹ کر پڑی رہتی ہیں۔ آٹھ بجے سے پہلے کروٹ نہیں بدلتیں اور آپ ہیں کہ اولے پڑے پر بھی نہا لیا اور جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔"

پوٹھو رام دمینتی کو اس کے دیر سے اٹھنے کی عادت پر بہت لعن طعن کیا کرتے تھے، لیکن اس وقت وہ نہاتے ہوئے کوے کی طرح پھول گئے۔ بولے "بیٹا! تمہیں کاہے کی پڑی ہے۔ ہمارے جیتے جی خوب ہنسو، کھیلو، سوؤ۔۔۔ جیسے تمہارے ماں باپ میکے میں تھے، ویسے یہاں بھی ہیں۔"

بڑی بہو کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ پوٹھو رام نے پردے کی وجہ سے نہیں دیکھا، لیکن سیتو نے بہو کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ لیں۔ کہاں تو وہ بڑی بہو سے لڑتی ہی رہتی تھی، کہاں اس نے برتن مانجھنے چھوڑ کر اپنے راکھ سے آلودہ ہاتھ جھاڑے اور ہاتھوں کو بہو کی کمر میں ڈالتے ہوئے بولی ''اور تو کیا جھوٹ کہتے ہیں؟ تم کیا جانو ہم تمھیں کتنا پیار کرتے ہیں۔ بس جرا تمھاری جَبان قابو میں ہو جائے نا۔۔۔نہ جانے اس وقت کیا ہو جاتا ہے تمھیں؟''

دمینتی بڑی شردھا سے بولی ''میں تو بنتی کرتی ہوں ایشور سے کہ آپ کا سایہ سات جنم تک ہمارے سر پر قائم رہے۔ آپ مارتے ہیں۔ پیار بھی تو کرتے ہیں۔ جو پیار کرے وہ مارے، جھڑکے لاکھ بار۔۔۔'' جانے چھوٹی بہو کو رشک آیا۔ بولی، ''پتا جی نے مجھے پریاگ لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔''

اب تک پوٹھو رام بابو، دمینتی کے جذبات کو جان چکے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں، کہنے لگے ''چھوٹی بہو کو ضرور پریاگ لے جاؤں گا۔ ہاں، نوبت کی ماں! میں نے اس سے وعدہ کیا ہے اور بڑی کو بھی لے چلوں گا اور منجھلی کو بھی۔ پھر کیا تم پیچھے رہ جاؤ گی نوبت کی ماں؟ کھلے موسم میں سبھی کو لے چلوں گا۔''

اور پولھو رام کے لب و لہجے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ سب کو پریاگ ہی تو لے جائے گا۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی اس بات کی حقیقت سے واقف تھی۔ جب وہ نئی نئی بیاہی آئی تھی تب بھی تو پتا جی نے کنگن کا وعدہ کیا تھا اور اب کہاں گیا وہ وعدہ؟

اگلے دن پولھو رام بابو کی آنکھ پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے سوچا وہ اتنی جلدی جاگ کر آخر کیا کرے گا؟ اس نے ایک ہاتھ سے رنگ پوری چھینٹ کا پردہ اٹھایا اور دریچے کے شیشوں میں لال چوک کی طرف جھانکا۔ کمیٹی کی بتیوں کو بجھانے کے لیے کمیٹی کا ملازم سیڑھی کندھے پر رکھے، آہستہ آہستہ پاٹھ شالا کی طرف جا رہا تھا۔ بتیوں کی بے بضاعت روشنی میں پرے، ایک بھینسا گاڑی اپنی تمام ہندوستانی سست رفتاری سے رینگ رہی تھی۔ ان گاڑیوں کے لیے نیومیٹک ٹائر بہم پہنچانے کی قرارداد دو برس سے کمیٹی میں پیش ہو رہی تھی، اس کے باوجود کمیٹی اور بھینسا گاڑی دونوں کی خواہش تھی کہ وہ دن ہونے سے پہلے پہلے شہر پناہ سے باہر ہو جائے۔ پولھو رام نے اپنا سر لحاف میں لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور معمول کی طرح بولا۔ ”سیتے، اٹھو نا، مجھے

چائے بنادو۔"

سیتو روزمرہ کی طرح چائے بنانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن جیسے ہی اس کے پاؤں ٹھنڈی کھڑاؤں میں داخل ہوئے، اسے کچھ یاد آ گیا۔ بولی۔ "کدھر جا رہے ہیں آپ؟۔۔۔ کوئی دفتر تو نہیں جانا ہے پڑے رہیے چپکے سے۔" پوکھو رام بابو بولا۔ "کدھر جا رہا ہوں میں؟۔ہاہا؟ اری پگلی! سیر کرنے بھی نہ جاؤں؟"

لیکن سیتو نے تو شاید سوچا تھا کہ ان کے پنشن پانے پر وہ بھی صبح کی چائے کے جھنجھٹ سے چھوٹ جائے گی اور اپنی بہوؤں کی طرح بڑے مزے سے اپنے خاوند کے پہلو میں پڑی رہی گی۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ پنشن تو صرف مردوں کو ملتی ہے۔ کبھی عورت کو بھی پنشن ملی ہے؟ گھر میں تو روز نوکری ہوتی ہے اور روز پنشن۔ اسے اٹھنے میں بہت دقت پیش نہ آئی۔ پوکھو رام نے اسی وقت کپڑے اتارے اور معمول کی طرح جلدی جلدی پانی کے کچھ ڈول نکال کر جسم پر انڈیل لیے۔

چائے پینے کے بعد پوکھو رام نے اتنے اونچے سروں میں برہمانند کے بھجن گائے کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ بہوویں بڑبڑانے لگیں اور بچّے رونے لگے۔ پاٹھ کے بعد

پوھو رام سیر کے لیے نکلا۔ ایک دو گھنٹہ تک تو وہ ریواز گارڈن کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ لیکن ریواز گارڈن سے بڑا ڈاک خانہ۔۔۔ اس کا پرانا دفتر دور نہیں تھا۔ پوھو رام کے قدم اسی طرف اٹھ گئے۔ اس کی حالت اسی سانپ کی مانند تھی جو بہت عرصے کینچلی میں زندہ در گور رہ کر جب اپنی کینچلی کو اتار پھینکتا ہے تو بہت دور بھاگ جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک بار اسے دیکھنے کے لیے ضرور واپس آتا ہے اور سوچتا ہے اس کمبخت نے مجھے سست بنا رکھا تھا؟ میری بینائی کمزور کر دی تھی، میں اچھی طرح سے چل بھی نہ سکتا تھا۔ اس کینچلی نے۔۔۔ اس جھلی نے۔۔۔ اس چمکتی ہوئی حقیر جھلی نے۔۔۔

ڈاک خانے کے سامنے پہنچ کر پوھو رام کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے سامنے گاڑیاں سرخ وردی پہنے قطار در قطار کھڑی تھیں اور ان پر نیا پالش کیا ہوا ”جی۔ آر۔ آئی“ چمک رہا تھا۔ چٹھیوں کے کمرے میں سارٹنگ پوسٹ مین ایک مشین کی سی سرعت سے چٹھیاں ڈربوں میں پھینک رہے تھے۔ پوھو رام نے کہا۔ انہی چٹھیوں نے تو مجھے بھگوان بھلا دیا تھا۔ یہیں مجھے دمہ کی شکایت شروع ہوئی تھی۔ آج میں ایک پرندے کی طرح آزاد و بے نیاز ہوں۔ اسی دفتر میں مَیں صبح

تاروں کی چھاؤں میں آتا اور رات تاروں کی چھاؤں میں واپس جاتا تھا۔ درمیان میں دو اڑھائی گھنٹے کی چھٹی ہوتی۔ لیکن وہ بھی ایسی کہ نہ تو دفتر رہ سکوں اور نہ گھر جا سکوں۔ اگر گھر جاتا تو شام کی حاضری سے دیر ہو جاتی اور اگر دفتر ہی رہتا تو بھوکوں مرتا۔ اسی لیے تو میں نے روٹی بھی دفتر ہی لے جانے کا معمول بنالیا تھا۔ اور شام کے وقت جب کسی بابو کے حساب میں فرق پڑتا تو رات کے دس گیارہ بج جاتے اور پوٹھو رام ان سب باتوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کام ختم کرنے کے بعد بھی وہ دفتر کی میز پر ٹانگیں دھرے بیٹھا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ دیر تک کام کرنے والے سے صاحب لوگ بہت خوش رہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پرندے سارا دن شہر اور اس کے مضافات میں دانہ دنکا چگنے کے بعد عقل حیوانی سے گھر کی جانب بے تحاشا کھچے جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن پوٹھو رام نے اپنے تمام قدرتی احساسات کو غیر قدرتی ضرورتوں کے تابع کر دیا تھا اور اس میں گھر جانے کی قدرتی حس مر چکی تھی۔ جب دفتر کے باقی بابو چلے جاتے اور خاکروب بتیاں بجھانے کے لیے ہال کے دوسرے سرے سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو پوٹھو رام کو محسوس ہوتا کہ وہاں اس کے پڑ رہنے کے لیے

کوئی جگہ نہیں ہے اور اب اسے گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہیں۔ اس وقت وہ اپنی لوہے کی چھڑی جس پر سے تمام پالش اڑ چکا تھا، تلاش کرتا اور گھر کی سمت چل دیتا اور دفتر سے گھر جانے کی بجائے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی گھر سے دفتر جارہاہے۔

میل موٹروں کا اصطبل بہت پرانا ہو چکا تھا اور لمبی لمبی درزیں اصطبل سے ریکارڈ روم تک چلی گئی تھیں۔ پوٖھو رام نے سوچا، ابھی کل ہی تو اس نے مرمت کے سلسلہ میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر کو چوتھا ریمائنڈر دیا تھا۔ شاید اس کا جواب آچکا ہو۔ اس کے دل میں اس کیس کا جواب جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن وہ ایک دو قدم چل کر رک گیا۔ اسے کیا؟۔۔۔ اس کے لیے تو خواہ ایک زلزلہ آ جائے اور سارے کا سارا ریکارڈ روم نیچے آرہے اور سب ضروری اور غیر ضروری ریکارڈ خراب ہو جائے۔ وہ تو اب اس کینچلی کو اتار چکا تھا۔

پوٖھو رام نے سوچا، کام کرنے والے کی قدر اس کے بعد ہوتی ہے۔ میں بارہ گھنٹے کی لگاتار نوکری دیتا تھا۔ اب محکمہ کو مجھ ایسا وفا شعار آدمی کہاں ملے گا؟ جب بھی کبھی صاحب آواز دیتا فوراً میرا جواب آتا۔ "جی حضور"! اور صاحب مجھ سے کتنا

خوش تھا۔ کہتا تھا، پوھو رام کتنا پابند آدمی ہے۔ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پابند، ہم نے بہت رات گئے اسے کام کرتے دیکھا ہے۔ اس سے دفتر کی ایفیشنسی (Efficiency) بڑھتا ہے۔ ہم اس کی ایکسلریٹڈ پروموشن کی سفارش کرے گا۔

پوھو رام نے سوچا اب کام کرتے ہوں گے اور اپنی جان کو روتے ہوں گے۔ معاً پوھو رام کو خیال آیا کہ جس شخص کو اس نے چارج دیا ہے، وہ تو نرا گاؤدی ہے۔ سیکریٹریٹ آفس کے دو کیس ہیں جنہیں میرے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اسے میری ضرورت کس شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہو گی۔ ہولے ہولے پوھو رام اس کمرے کی طرف ہو لیا، جہاں وہ ہر روز بیٹھا کرتا تھا۔

دور کھڑکی میں پوھو رام کو اپنے قائم مقام کا سر نظر آنے لگا۔ وہ کاغذوں پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی اٹھا اور کسی ضرورت سے برآمدے کی طرف چلا آیا۔ پوھو رام نے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن وہ بھاگ نہ سکا۔

اچانک اس کے قائم مقام کی نظر پوھو رام پر پڑی اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہلو، ہلو پوھو رام جی، کیا حال ہے آپ کا؟“

"اچھا ہے" پولھورام نے جواب دیا۔ "کیسے تشریف لائے آپ؟"

"یونہی۔۔۔خط ڈالنے چلا آیا تھا۔"

اس کے بعد وہ بابو ہنسا اور قریب ہی کے ایک کمرے میں گم ہو گیا۔ اس نے فائلوں کے متعلق پولھورام سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ پولھورام سخت حیران تھا۔ "مجھے کیا؟ میرے لیے اب فائلیں خواہ برس بھر بنا جواب دیئے پڑی رہیں، بچہ جی کو چارج شیٹ لگے گا۔ ترقی رک جائے گی، پھر مزہ آئے گا۔"

پولھورام کے پاؤں جو کہ سیر کی وجہ سے تھک گئے تھے۔ اب گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ لیکن اسے پھر خیال آیا، کیا عجب جو بابو کو ان کاغذوں کے متعلق جو کہ میں نے نچلی دراز میں 'خفیہ' کا نشان دے کر رکھے تھے، کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال۔ اس نے اگر نہیں پوچھا تو میں ہی بتلا دوں۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہ میری جان کو دعائیں دے گا اور پولھورام اپنے قائم مقام کی طنز آمیز مسکراہٹ کو بھول ہی گیا۔

جب ہمّت جمع کر کے پولھورام نے اپنے قائم مقام کو کاغذوں کے متعلق تاکید کی

تو اسے پتہ چلا کہ اس نے تمام کاغذ دراز میں سے نکال لیے تھے اور ان کا مناسب جواب بھی دے چکا تھا۔ پوھو رام نے سوچا غلط سلط جواب دے دیا ہو گا اور پھر پوھورام اپنے قائم مقام کے ہونے والے حشر پر آنسو بہاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی پوھو رام نے پھر اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا اور ہر روز یہی ہوتا رہا۔ بچے پہلے تو ڈر کر اپنی ماؤں کی گودیوں میں چھپ جاتے، پھر اس قسم کی پوجا سے مانوس ہو گئے اور دادا کے ساتھ ہم نوا ہو کر محلہ کو سر پر اٹھانے لگے۔ بہوؤں کو بڑی دقّت پیش آتی تھی۔ پہلے وہ گھر میں آزادانہ گھوما کرتی تھیں، لیکن اب انہیں ایک لمبا سا گھونگٹ نکالے اندر باہر جانا پڑتا تھا۔

اور پوھورام جاتا بھی کہاں؟ گھر کے سوا اس کا ٹھکانا بھی تو کہیں نہ تھا۔ اس کی شہر میں واقفیت تو تھی لیکن ایسی تو کسی کے ساتھ نہ تھی کہ اس کے پاس سارا دن ہی گزار دے۔ کبھی کبھی وہ گھراؤ رام پان فروش کی دکان پر جا بیٹھتا اور محلہ کی بد چلن عورتوں کی باتیں کیا کرتا اور کبھی کھانڈ کی دکان پر کھانڈ کا روزمرہ بدلنے والا بھاؤ پوچھنے چلا جاتا۔ پوھو رام کھانڈ کے نرخ میں اتار چڑھاؤ سے قومی، بلکہ بین الاقوامی حالات کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اس کے سوا اور اسے کوئی شغل نہ تھا۔ اس نے

چٹھیوں اور منی آرڈروں کے سوا اور سیکھا بھی کیا تھا۔ اس روزمرہ کے شغل پر ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا اور اگر کہیں اسے اخبار کا پرچہ مل جاتا تو زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی گھنٹے گزر جاتے۔ اس کے بعد گھر جانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا اور گھر پہنچتے ہی وہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا۔ یہ سلائی کی مشین بلا ضرورت بھلا یہاں کیوں پڑی ہے؟ اور یہ تیل کی کُپّی، اور ابھی تک کسی نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ خدا جانے اس گھر میں چار عورتیں کرتی کیا رہتی ہیں اور ان بچوں کا رونا مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔۔۔ غرض کہ پوکھورام اتنا چڑچڑا ثابت ہو رہا تھا کہ بہوئیں تو ایک طرف خود سیتو بھی اسے محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک دن پوکھورام دن بھر لڑتا جھگڑتا رہا اور سب کا خیال تھا کہ آج گالی گلوچ، مار پیٹ ہو کر رہے گی۔ لیکن شام کے قریب نوبت رائے پوکھورام کا بڑا لڑکا آیا تو پوکھورام نے پوچھا۔ "وہ پچیس روپے کا منی آرڈر کروا دیا تم نے؟"

"کروا دیا پتا جی۔" نوبت بولا۔

"کیا فیس دی؟"

”چھ آنے۔“

”ہیں!“ پوٹھو رام نے ایک دفعہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ ”ارے نوبت! کتنا بھولا ہے تو، یہ بھی نہیں جانتا۔ پچیس روپے کو چونی کمیشن لگے۔ یہ تو بازار کا ایک گنوار بھی جانے ہے اور تو جو پوٹھو رام ریٹائرڈ اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر کا لڑکا ہے، تجھے اتنا بھی نا مالوم کہ پچیس پر چونی فیس دی جائے۔۔۔ ہاہا۔۔۔ واہ رے واہ۔۔۔ ہاہا۔۔۔“

اور پوٹھو رام کبھی خفا ہوتا اور کبھی ہنسنے لگتا۔ چھوٹی بہو بھی ہنسی میں شریک ہو گئی۔ بولی۔ ”میرا جیٹھ تو سچ مچ بھولا مہیش ہے۔ دونی مفت میں زیادہ دے آیا اور اب وہی بھرے دونی۔ ہاں بہن! ہم یہ دونی سانجھے کھاتے میں نہ لکھنے دیں گے۔ دونی کا نمک ہی آجاتا ہے۔ سارا مہینہ چل جاتا ہے دونی کا نمک۔“

چھوٹی بہو بڑے گھر کی لڑکی تھی نا۔ وہی پوٹھو رام کے ساتھ ہر بات پر متفق ہوتی تھی۔ دونوں امیر اور فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ پوٹھو رام نے کہا ”۔۔۔ ہاہا۔۔۔ پچیس پر چھ آنے فیس دے آیا۔۔۔ ای ہی کھی کھی۔۔۔ اور نوبت بھی ساتھ مل کر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

پلٹتے ہوئے پوٹھو رام نے پوچھا۔ ”کون تھا بابو؟“

نوبت رائے نے بڑے لمبے چوڑے طریقے سے بابو کی شکل بیان کی۔۔۔ وہ موٹا تھا۔۔۔ لیکن موٹے تو سب ہی بابو ہوتے ہیں اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ پوٹھو رام بولا۔ ”نتھنے تو کئی بابوؤں کے پھولے ہوئے ہیں۔“ اس کی آنکھیں بے تحاشہ تمباکو پینے سے بہت میلی ہو چکی ہیں۔ لیکن آنکھیں تو درجنوں بابوؤں کی میلی ہیں اور آج کل تو ہر ایک بابو بے تحاشہ تمباکو پیتا ہے۔ آخر لنگی سے سمجھ میں آیا کہ بابو روپ کشن نے ہی دونی زیادہ لے لی ہو گی۔ رسید پر بھی تو اسی کے دستخط دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہے ہی پاجی، بڑا کمینہ آدمی ہے، عیاش ہے، فاسق ہے۔ ایک عورت بن بیاہی ڈال رکھی ہے۔ وہ ایسی باتیں نہ کرے تو گزر کیسے ہو اور آخر تان یہاں ٹوٹی۔ ”ارے! تو اتنے بڑے پوسٹ ماسٹر کا لڑکا ہو کر دونی زیادہ دے آیا۔“

نوبت اور اس کی بیوی دمینتی شرم سے گردن جھکائے رسوئی میں دبکے رہے۔ نوبت اپنے گھٹنوں میں سر دیے کچھ سوچتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رو دے۔ لیکن وہ اپنی چھوٹی بھاوجوں کے سامنے نہیں روئے گا۔ جب وہ سونے کے لیے جائے گا تو اپنی بیوی کی گود میں سر رکھ بے تحاشا روئے گا اور خوب ہی دل کا بخار

نکالے گا۔ اس وقت تو وہ چولھے کے پاس بیٹھا ہوا ایندھن کے چھوٹے چھوٹے تنکے اٹھا اٹھا کر جوالا میں پھینکتا رہا۔

شام کے قریب دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ پولھو رام نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ اس کا قائم مقام تھا۔ پولھو رام کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ اسے کچھ کہے بغیر ہی الٹے پاؤں اندر بھاگ آیا۔ سمو سے لانے اور چائے بنانے کا حکم دے کر خود بیٹھک میں چلا گیا اور بڑی عزّت و تکریم کے ساتھ اپنے قائم مقام کو اندر بٹھایا۔ اس شخص کو کسی کیس میں پولھو رام سے مشورہ لینا تھا۔ پولھو رام نے فوراً الماری سے پرانی والیوم ٦ نکالی اور اس خاص موضوع پر تمام رول اس کے سامنے رکھ دیے اور پھر وعدہ کیا کہ وہ تمام رات بیٹھ کر ان نکتوں کے مطابق ڈرافٹ تیار کرے گا۔ پھر اس نے بابو روپ کشن کی شکایت کی اور اس کا قائم مقام رخصت ہوا۔

اندر آتے ہی پولھو رام بولا۔ ''وہ سب کہتے ہیں میرے بغیر دفتر چوپٹ ہو رہا ہے۔ یہ بابو بھی میری طرح اڑھائی سو تنخواہ پاتا تھا۔۔۔ہے، اور مجھ سے مشورے کے لیے اتنی دور سے چلا آیا ہے۔ ایک دن کوئی آدمی ملتان سے میری شہرت سن کر

آیا تھا۔ صاحب کہتا تھا مجھے پوھو رام پر ناز ہے اور یہ ہے میرا بیٹا جس نے میرے نام کو لاج لگا دی۔"

اور ریٹائر ہونے کے اس چھ ماہ کے عرصے میں آج شاید پہلا دن تھا، جب کہ پوھو رام مسرور نظر آتا تھا۔ آخر اس کا قائم مقام اتنی دور سے مشورہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔ پوھو رام سارا دن گاتا رہا۔ کچے تاگے سے کھچی آئے گی سرکار مری۔ اور اسے خوش دیکھ کر چھوٹی بہو نے اپنے بچے کو پِتا جی کی گود میں دھکیل دیا۔

پِتا جی بولے۔ "چھوٹی بہو کتنی اچھی ہے۔ دیکھو اسے سارے گھر کے لیے دونی کے نمک کا خیال آیا اور تو کنتو، تو بڑی خراب ہے۔ تجھے اپنی بیٹی کے سوا اور کچھ سوجھتا بھی نہیں، اور شانو۔۔۔ شانو ہے بھی تو بہت پیاری۔ بس اسے دیکھتا جائے آدمی۔ دیکھو کیسے آنکھیں موند لیتی ہے۔۔۔ ہات۔۔۔ چھی۔۔۔ اور میں اسے لا دوں گا ایک ملائم سی گڑیا اور سیتو! کل میں نے سیف میں دو دھیلے بھی رکھے تھے لانا ذرا وہ۔ ایک مُنّے کو دوں گا اور ایک مُنّی کو۔" اور چھوٹی بہو مسرت کے احساس سے بولی۔ "پِتا جی! آپ نے مجھ سے رس گلوں کا وعدہ کیا ہے۔"

پوھو رام بولے۔ "میں جانتا ہوں تو بہت شوقین ہے رس گلوں کی۔ میں

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین روپے کے رس گلے لاؤں گا اور بڑی بہو کے لیے مالا لاؤں گا اور منجھلی کوئی دوسری شے، وہ بھی تو اپنی ہی بیٹی ہے نا۔ ایسے ہی جیسے د مینتی میری بیٹی ہے۔"

د مینتی بڑی بہو اپنے شوہر کی دونی کو بھی بھول گئی اور دل میں سوچنے لگی۔ پِتا جی بھی ایسے برے کیا ہیں۔ مارتے ہیں تو پیار بھی تو کرتے ہیں، اور نوبت رائے اپنی بیوی کے اس انحراف پر دل ہی دل میں اسے کوسنے لگا۔ پوٹھو رام نے سب سے رس گلوں کا وعدہ کر لیا اور چھوٹی بہو سب کچھ سمجھتی تھی اور کہتی تھی۔ بس رس گلے ہی تو آ جائیں گے۔ کنگن بھی آ گئے، پریاگ بھی ہو آئے۔ نوبت کی ماں سمیت۔۔۔ اور فقط رس گلوں کی کسر ہے۔

پوٹھو رام نے تمام رات جاگ کر ڈرافٹ تیّار کیا اور صبح جب وہ دفتر میں پُر غرور انداز سے داخل ہوا تو اس کے قائم مقام کے سوا اور کسی نے اس کی پروانہ کی۔ صاحب بھی تینوں مرتبہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر گزر گیا۔ پھگو خاکروب نے بھی اسے قابل اعتنانہ سمجھا۔ پوٹھو رام نے بابو روپ کشن سے دونی مانگی، مگر وہ صاف مکر گیا۔

پولھورام نے سوچا شاید نوبت نے وہ دونی دمینتی کو کچھ لا دینے کے لیے اڑالی ہو گی۔ ضرورت تھی تو گدھا صاف مانگ لیتا۔ یہ اُچک لینے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر، گھر چل کر اس سے پوچھا جائے گا۔ گھر پہنچا تو نوبت موجود نہ تھا۔ پولھورام اونچے اونچے برہمانند کے بھجن پڑھنے کے بعد گھر کی عورتوں پر برسنے لگا اور ان سب کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ خود بھی تو پولھورام اس زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ یکم کی صبح کو جب وہ پنشن لینے گیا تو حسب دستور نوٹس بورڈ پڑھنے لگا۔ ڈاک خانے کو شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں ایک اکسٹرا ڈپارٹمنٹل ڈاک خانے کی ضرورت تھی اور اس کے لیے پچیس روپے مع کرایہ مکان اور اسٹیشنری ملتے تھے۔

اس وقت اپنے قائم مقام کی مدد کام آئی اور پولھو رام نے وہ پچیس روپے کی نوکری کر لی۔ اب وہ صبح آٹھ بجے ہی نکل جاتا تھا اور رات کو دیر سے گھر آتا۔ کام کی کثرت سے اس کا دمہ جو کہ معمولی حالت میں تھا، خوفناک صورت اختیار کر گیا۔ بسا اوقات منی آرڈر بک کرتے ہوئے اسے دورہ پڑتا تو پیسے، بیمے، رسیدیں سب میز پر بکھر جاتیں۔ اس کا منہ سُرخ ہو جاتا۔ آنکھیں پتھرا جاتیں اور منہ

میں سے کف کے چھینٹے اڑ کر کھڑکی میں سے داخل ہونے والی روشنی کی کرن میں ایک ہیبت ناک قوس قزح کا رنگ بھرتے، منہ، ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا اور اسی حالت میں پوھو رام کھڑکی کے قریب فرش پر لوٹنے لگتا۔ پبلک کے آدمی کاؤنٹر پر بکھرے ہوئے پیسوں کو اس کے لیے سمیٹتے اور بڑے رحم کی نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھتے اور کہتے۔ ”ڈاک خانہ کیوں نہیں اس غریب بوڑھے کو پنشن دے دیتا؟“

# ہڈیاں اور پھول

آٹھ، نو مہینے کے متواتر استعمال سے میرے بوٹوں کے تلے گھس گئے تھے اور ان میں دو ایک ایسے چھوٹے چھوٹے سوراخ پیدا ہو گئے جن میں سے کیچڑ داخل ہو کر انہیں گیلا کرنے کے علاوہ میری طبیعت کی عیاشی کے ثبوت، یعنی ریشمی جرابوں کو خراب کر دیا کرتی۔ ایک قسم کی لچلچاہٹ کی کیفیت میں میرے حواسِ خمسہ، اپنے پاؤں اور ان میں لتھڑے ہوئے کیچڑ میں سمٹ آتے۔ میرے دماغ میں کوئی نازک خیال جگہ ہی نہ پا سکتا گویا میرا دماغ ایک ناقابلِ گزر دلدل بن گیا

ہو۔

اس وقت میں ڈرتا ڈرتا ملم کے پاس گیا۔ ملم، جیسا کہ میں اسے بطور ایک پڑوسی کے جانتا تھا، ایک تنہائی پسند، غصیلا موچی تھا۔ وہ کئی بار اپنی بیوی کو پیٹا کرتا، شاید اسی لیے وہ بیمار ہو کر بچوں سمیت میکے بھاگ گئی تھی اور وہاں سے اس نے آج تک رسید کا خط بھی نہ بھیجا تھا۔۔۔ ملم کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی، جس میں دو تین کاریگر، ایک مٹّی کے تیل کے پرانے لیمپ کے نیچے پتنگوں اور پروانوں کی بارش کے باوجود بہت رات گئے تک بیٹھے کام کیا کرتے تھے اور مجھے اپنے چوبارے پر سے فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے نظر آیا کرتے۔

ملم کے علاوہ اس وسیع کالی باڑی میں کوئی اور موچی تھا بھی نہیں اور ملم بھی عام موچیوں کی طرح کالی باڑی میں سے گزرنے والے ہر راہ رو کے پاؤں کی طرف دیکھا کرتا اور بوٹ کی پالش کے حساب سے بوٹ والے کی مالی حیثیت کا اندازہ لگاتا۔ حالاں کہ وہ عام موچیوں کی طرح ناسمجھ آدمی تھا اور جہاں تک مجھے علم تھا، وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا تھا، اس کے باوجود اسے بھی بوٹ ہاتھ میں لیتے ہی بیس کے قریب مرمّت طلب جگہوں کی طرف اشارہ کرنے کی عادت تھی۔۔۔ یہاں

سلائی ہو گی۔ یہاں بھی سلائی ہو گی۔ اس جگہ اسٹار لگیں گے اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد ایڑیوں میں لپّا لگے گا اور اس لپّا کے لفظ سے مجھ بہت چڑ تھی۔

کالی باڑی کے بازار میں ڈونگر محلہ کے سب کتّے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی دُم سونگھ رہے تھے اور ملم اپنی آر کو ایک کھُردرے، خام چمڑے میں دیے، نہایت دلچسپی سے ان آوارہ کتّوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک رازدارانہ لہجے میں صرف اس لیے کلام کیا کہ شاید وہ اس طرح مزدوری کم طلب کرے گا اور کیا معلوم جو وہ لپّے کا ذکر ہی نہ کرے۔

"ان کتوں کا آپس میں متعارف ہونے کا ڈھنگ بھی عجیب ہے۔" میں نے ضرورت سے زیادہ ہنستے ہوئے کہا۔ ملم نے بھی اپنے دانت دکھا دیے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ کاروباری طور پر مجھ سے افضل ہے اور میری اس رمز کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ صندوقچی میں سے کیلی، ستلی اور موم تلاش کرنے لگا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور کاریگر روٹی کھانے کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پرانے اور خام چمڑے کے سینکڑوں ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ملم نے آر اٹھائی، اسے پتھر پر رگڑا اور

میرے بوٹوں کی سلائی شروع کر دی۔

ملم کی خاموشی کی وجہ سے میں سلسلۂ گفتگو دراز نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد اپنی روئی دار بنڈی کے سوتی بٹن بند کرتے ہوئے وہ خود ہی بولا۔

"ان کتّوں کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی بات یاد آ گئی، بابو جی۔"

میں تجسّس کی وجہ سے خود ہی ملم کی بھاگی ہوئی بیوی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا، لیکن جب ملم نے ہی وہ سلسلہ چھیڑا تو میں نے رسمی طور پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتّوں سے؟۔۔۔ گھر کی بات؟"

ملم کچھ جھینپ سا گیا اور دوسرے بوٹ کے لیے تلا تلاش کرنے کو صندوقچی پر ضرورت سے زیادہ جھُک گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا، جیسے میں اس کی بات بہت دلچسپی سے نہیں سُن رہا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ غصیلا موچی اپنے من کی بات کہہ دے گا۔ چنانچہ اس نے ستلی پر موم رگڑنے سے پہلے احتیاطاً ایک بار میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی دیا سلائی اور سگرٹ میں نیم متوجہ

پا کر بولا۔ ”انہیں کتّوں کو دیکھ کر گوری نے ایسی بات کی جو ان دنوں مجھے بہت ستاتی ہے۔ میں اس سے عموماً جلا کٹا ہی رہتا تھا۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر پیٹا کرتا اور کہتا، ہڈّیاں توڑ دوں گا تیری۔ حالاں کہ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تو رہ گئی تھی اور اس کے منہ پر سرسوں کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس دن بھی ڈونگر محلہ کے سب کتّے کالی باڑی کے اس بازار میں چلے آئے تھے اور ایک بڑا سا کتّا ایک کھجلی ماری کتیا کے سامنے اپنی دُم ہلا رہا تھا، جیسے بڑا پیار جتا رہا ہو اور گوری تو جانے کاگ بھاشا ہی سمجھتی تھی۔ وہ یہاں، اسی جگہ، اسی دہلیز، اسی دروازے کا سہارا لیے کھڑی مُسکراتی رہی۔ پھر سامنے کتّوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو تو وہ کیسے دُم ہلا رہا ہے۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک تنومند کتّا بھی کتیا کے بدصورت ہو جانے پر اس کی محبّت کا دم بھرے جاتا ہے، تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے؟ تم جو ایک شرابی اور بدصورت آدمی ہو۔ روگ تو جی کا ساتھ لگا ہی ہوا ہے اور پہلے میں کتنی تندرست ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ کتّا غرانے لگا اور اپنے اگلے پنجوں سے مٹّی کُرید کر پیچھے کی جانب

پھینکنے لگا۔ شاید وہ اپنے رقیبوں کو مُقابلے کے لیے اکساتا تھا۔ لیکن میں نے گوری سے کہا۔ ”دیکھو تو وہ کتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے۔۔۔ اسے بھی یہ کھجلی ماری، مریل مادہ پسند نہیں۔“

اس کے بعد وہ چُپ ہو گئی۔ پھر جیسے کہ اس کی عادت تھی، سامنے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کے خالی پوے اور ادھیے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کترے ہوئے یا ادھ ٹوٹے کاگ پڑے ہیں۔ وہ ایک گیت گنگنانے لگی، جس میں ایک آدمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تو میرے لیے بلائے جان ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ تو مر جا، مجھے رنڈوا ہونے کا شوق ہے۔ بابو جی، اس گیت کا مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ میں اس وقت گا کر نہیں سُنا سکتا اور مجھے ابھی دوسرا تلا بھی لگانا ہے۔۔۔ اور ہاں شاید آپ کو بھی ڈاک خانے جانا ہو گا۔“

میں نے بوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ خاموش طبیعت موچی آج کتنا باتونی ہو گیا ہے اور باتونی مزدور کام اچھا نہیں کرتے۔ پھر بھی میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تو ملم۔۔۔ مجھے آج چھٹی ہے۔“

ملم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو وہ آدمی کہتا ہے، تو اپنے میکے جا کر

مرنا۔ پھر میں وہاں تیرے پھول چُننے اور تیری موت پر افسوس کرنے کے لیے آؤں گا۔ وہ جواب دیتی ہے تم ہرگز ہرگز وہاں نہ آنا۔ میں مرگئی۔۔۔ماں باپ کی چندن کی شہتیری بہہ گئی۔ تمہارا کیا گیا اور اس کے بعد قضا کار وہ مر جاتی ہے۔ تو وہ اس کی سمادھ پر جا کر کہتا ہے۔۔۔

"گوری، ایک دفعہ تو بول، دیکھ میں کتنی دھوپ میں، کتنی دور سے پا پیادہ تیری سمادھ پر آیا ہوں۔" جنڈ کی چتکبری چھاؤں موت کی آواز بن کر کہتی ہے، میں مرے ہوؤں سے انسان کا سا عارضی پیار نہیں کرتی۔ ملم کہتا ہے گوری ایک دفعہ تو جی لے۔ میں نے رنڈوے ہو کر بہت دکھ پایا ہے۔"

اس کے بعد ملم نے میرے جوتوں کی سلائی چھوڑ دی۔ اپنی پگڑی سے پلّو اتارا اور اس سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔ جذبات کی رَو میں میری آنکھیں بھی نم ناک ہو گئی تھیں۔ اس وقت میں گیت کی افسانوی قیمت پر غور کر رہا تھا۔ ملم نے ایک ایسی بات بتائی جو انسانی فطرت پر ایک طنز تھی، وہ یہ کہ جب اس کی بیوی دلہن بن کر آئی تو ملم اس کی جوانی اور خوبصورتی کی بے طرح پاسبانی کرنے لگا۔ وہ اسے دروازے میں بھی کھڑی دیکھتا تو پیٹنے لگتا۔ یہ شک و شبہ کی عادت ابھی تک باقی

تھی۔ اس وقت جب کہ گوری کا جسم توانا اور بھرا ہوا تھا، وہ اسے کہتا رہا۔ مجھے ایک پتلی، نازک عورت پسند ہے اور جب وہ دبلی ہو گئی تو کہنے لگا، مجھے تم سی مریل عورتوں سے سخت نفرت ہے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ جب وہ کتّوں والا واقعہ پیش آیا تھا۔

موچی کی ان سب باتوں سے میں نے یہی اخذ کیا کہ گوری آخر میکے جا کر مر گئی ہو گی۔ آخر ملم کے اتنا جذباتی ہو جانے کا کیا سبب؟ اس وقت مجھے وہ کہانی نامکمل سی دکھائی دی اور میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”پھر اس کے بعد کیا ہوا۔۔۔؟ تم نے بات تو ختم ہی نہیں کی۔“

ملم بولا۔ ”اس تین چار ماہ کے عرصے میں اُدھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ وہ پہلے ہی بہت بیمار تھی، مر گئی ہو گی۔ سنتان پور یہاں سے تین چار سو کوس دور پورب دیس میں ہے۔ اپنا تھوک ڈاک خانہ لگتا ہے۔ میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ میرے پاس کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے غصیلے پن سے سبھی نالاں ہیں۔ کوئی مجھے مانگے کی ایک کوڑی بھی تو نہیں دے ہے۔ یہاں شراب کی کچھ بوتلیں پڑی ہیں اور بس۔ بابو جی میری خواہش ہے، میں ایک دفعہ وہاں افسوس کرنے کے

لیے تو چلا جاؤں۔"

لیکن ملم کا وہ خیال خام تھا۔ اس چمڑے کی طرح خام، جو اس نے باتوں باتوں میں میرے بوٹ کے نیچے لگا دیا تھا اور جو ایک ہی مہینے میں گھس گیا۔

اس ایک مہینے کے اندر ملم ایک دن میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ میں اس وقت چوبارے کے چھجے پر بیٹھا کاٹھ کے جنگلے پر ٹانگیں لٹکائے، پڑھنے کی بجائے کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ ملم نے ایک ہاتھ اونچا کیا۔ "خط ہے۔۔۔ بابو جی ایک خط ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے چوبارے پر سے اُتر کر خط پڑھا۔ سنتان پور سے آیا تھا۔ ملم کو ایک دو لفظوں کی سمجھ نہ آتی تھی۔ اس خط میں گوری کے متعلق لکھا تھا۔ وہ محض چھاچھ کے استعمال سے تندرست ہو گئی تھی اور چترتی کے بعد واپس آ رہی تھی۔ گنیش چترتی کا چاند دیکھنے سے کوئی الزام لگ جاتا ہے۔ خود کرشن مہاراج، جنہوں نے کسی جانور کے کھُر سے بنے ہوئے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی کے اندر چاند کا عکس دیکھ لیا تھا، تہمت سے نہ بچے۔ اس چترتی کو گزار کر آنا ضروری تھا۔

خدا بیکار آدمی کو کام دے! میں ان دنوں اپنے چوبارے میں بیٹھا ملم کی فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے ملم کی سب حرکات دیکھا کرتا۔ جب اس کے ساتھ کام کرنے والے کاریگر چلے جاتے تو ملم ایک کھونٹی پر لٹکے ہوئے چٹلے کو اتار لیتا اور بڑے اجڈ اور وحشیانہ انداز سے اسے پیار کرنے لگتا۔ جیسے کوئی ننھی منی سی لڑکی گڑیا سے کھیل رہی ہو اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس بے جان گڑیا سے ہزاروں بے معنی باتیں کر لیتی ہو۔ چٹلے کے علاوہ گوری کوئی میلا کچیلا دوپٹہ الگنی پر بھول گئی تھی۔ ملم اسے اتار کر اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچنے لگتا۔ بیوی اور اس کے بعد اس کا چٹلا اور پھر دوپٹہ اور چند پوے ملم کی محدود کائنات تھی۔ غصیلا اور لڑاکا ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔ گوری نے میکے جا کر اسے خوب ہی سزا دی اور اپنی بیماری کا کیا سہل علاج دریافت کر لیا۔ چھاچھ!

میں سوچنے لگا۔ اب ملم نے گوری کی قدر پہچانی ہو گی اور جب وہ چترتی کے بعد واپس آ جائے گی، تو وہ اس کی پوجا کیا کرے گا۔ اس وقت دھوپ کی معتدل حرارت میں مجھے کچھ نیند سی آنے لگی اور میں گوری کے گیت کے متعلق سوچتا

ہوا او نگھنے لگا۔ اس وقت ایک خیال میرے دماغ میں آیا۔۔۔ جیتے جی انسان کی ہڈیاں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد پھول ہو جاتے ہیں۔

چترتی کے تیسرے روز ملم کی بیوی کو آنا تھا۔ اس دن ملم نے فیکٹری کے تمام مزدوروں کو چھٹی دے کر اپنے احمقانہ پن اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ وہ خود تمام دن گاڑی کے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اس دن ملم نے روز کے نشے میں سے آدھ سیر جلیبیوں کی گنجائش نکالی اور ایک آب خورے میں آدھ سیر دودھ لا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور بلّی کے ڈر سے موری کے منہ پر چھوٹی چھوٹی اینٹیں لگا دیں۔

گذشتہ دنوں میں، ڈونگر محلہ کے چھوکروں اور کالی باڑی کے چیتر جیوں، مکر جیوں اور باسوؤں کے لڑکوں کی گُلیاں اور گیند ٹوٹے ہوئے روشن دان سے ملم کی فیکٹری جا پڑے تھے۔ چھوکروں نے ڈر سے انہیں مانگنے کی جرأت ہی نہ کی تھی۔ اکیلا ملم ہی اپنی گوری کے آنے کا منتظر نہیں تھا، وہ بچے بھی اس کا انتظار کر رہے تھے اور آج ملم کے گھر کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ کب وہ آئے گی اور گُلی دے گی۔ پڑوس کے نابینا استاد کی لڑکی ثرّیا کئی دفعہ پوچھ چکی تھی۔ ”خالہ کب

آئے گی؟" گوری کا پڑوس کی سب عورتوں سے میل جول تھا۔ وہ ثریّا کا سر دیکھ دیا کرتی تھی جس میں پار سال لیکھیں پڑ گئی تھیں۔ فیکٹری کی پشت کی جانب جوالا پرشاد کا گھر تھا۔ وہ ایک بار ایک دن کے نوٹس پر تبدیل ہوا تھا، تو ملم کی بیوی نے ایک دن میں اس کے تین درجن کے قریب کپڑے دھو ڈالے تھے۔ یہ سب کے سب چترتی سے، تیسرے روز کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ بار بار گوری کے متعلق پوچھتے تو ملم کو اپنی نامقبولیت کے مقابلے پر گوری کی مقبولیت کا احساس ہوتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، شاید یہ سب کچھ گوری کی خوب صورتی کی وجہ سے ہو گا۔ عورتیں بھی تو عورتوں پر عاشق ہو جاتی ہیں۔ اس کی سہیلیاں بن جاتی ہیں اور اس کے ارد گرد منڈلاتی ہیں۔ پھر اس میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور جب کبھی کوئی نوجوان پڑوسی اس کے گھر کے متعلق بات کرتا تو ملم نہایت شک و شبہ کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا۔ اسی لیے میں نے گوری کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کو یادداشت سے احتیاطاً خارج کر دیا تھا۔ حالاں کہ مجھے بھی خواہش تھی کہ میرے چوبارے کے سامنے تھوڑی سی رونق ہو جائے اور اس سونی فیکٹری کے اندر سے ایک پتلی سی خوب صورت آواز آیا کرے۔ ایک دم سے پھول سا

چہرہ دکھادے اور چھپ جائے۔ گوری کے چلے جانے کے بعد مدّت تک میں اس خلا کو محسوس کرتا رہا تھا۔ اس حالت میں یہ کمی ملم کو کیسے نہ اکھرتی ہوگی۔ ملم کو، جس کی گوری اپنی ملکیت تھی اور جسے اس پر بجا غرور تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر آج شاید پہلی دفعہ ملم میں چڑچڑا پن چھوڑ دینے اور ہر کسی سے میل ملاپ رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بچوں کی گُلیاں اور گیند اٹھائے اور میدان میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو دے دیے۔ پھر اس نے ثریّا کو بلایا۔ اس کے ساتھ دو تین اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔ ملم نے جیب میں سے اکنّی نکالی اور اسے ثریّا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے بولا۔ ”یہ خرچ کرلو، لیکن دیکھو بیٹا! تیل کی چیز مت کھانا۔“

اس ”تیل کی چیز مت کھانا“ میں زندگی، اچھی زندگی اور اس کی متعلقہ رجائیت سے ایک غیر مشروط صلح کا جذبہ ظاہر تھا۔ اس دن ملم اسٹیشن پر بیوی کو لینے گیا اور جب شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔ وہ یوں ہی مغموم اداس واپس چلا آرہا تھا۔ سنتان پور سے آنے والی گاڑی میں اس کی بیوی نہیں آئی تھی۔

اس دن ملم نے بچے ہوئے پیسوں سے شراب منگوائی اور خوب پی اور پگڑی کے کھلتے ہوئے پیچوں کو لپیٹ لپیٹ کر گندی گندی گالیاں دیتا رہا۔ شام کے قریب اس نے دوپٹے کو اتارا اور اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ پھر خود بخود اس کی ڈھارس سی بندھی، اس کے باوجود کہ وہ نشے میں تھا اور وہ دیوانے کتّے کی طرح منہ میں کف پیدا کیے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومنے لگا۔ کبھی کبھی چٹلے کو اتار کر چوم بھی لیتا۔ مجھے ان روشن دانوں میں سب کچھ نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے ساتھ رہنے والے یٰسین کو بھی ملم کی حرکات دکھائیں۔

رات کے نو، ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ میں اور یٰسین چھجے پر کھڑے ملم کو دیکھ رہے تھے۔ مٹّی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں ملم نے ہمارے دیکھتے دیکھتے سب کپڑے اتار دیے اور ننگا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہیں سے اپنی بیوی کی سرخ صدری برآمد کی اور اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کی خالی بوتلیں اور ڈھکنے پڑے رہتے تھے، وہ اکیلی صدری پہن کر سو گیا۔

اس کے بعد ایک اور خط آیا جس میں ملم کی بیوی نے اپنے نہ پہنچنے کی وجہ بتائی تھی۔ کہیں چترتی کے روز بھولے سے اس وہمی عورت کی نظر چاند پر پڑ گئی تھی

اور اب وہ اپاپئے کروا رہی تھی۔ خط میں اور باتوں کے علاوہ سنتان پور سے واپسی کی مقررہ تاریخ بھی لکھی تھی۔ اس دن حسب دستور ثریّا اور دوسرے بچّے پوچھنے کے لیے آئے اور ہم نے قصداً اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔ اس دن مغل پور کے اسٹیشن پر سے کسی لیڈر کو گزرنا تھا، اس لیے میں اور یٰسین نے بھی اسٹیشن جانے کا ارادہ کر لیا۔

ملم نے اس دن بھی حسب معمول فیکٹری کے کاریگروں کو چھٹی دے دی اور آبخورے میں دودھ منگوا رکھا۔ کاریگر بھی ملم کے اس اضطراب اور اس کی بیوی کے آنے پر، نہ آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنستے تھے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے۔

شام کے جھٹ پٹے میں ملم اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اسٹیشن قصبے سے پَون میل کے قریب تھا اور ابھی اتنی روشنی تھی کہ راستے میں شاہ جی کے باغ کے سنگترے اور ان کا نارنجی رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار آوارہ جانور باڑھ کو توڑ کر باغ کے اندر داخل ہو رہے تھے اور ہمارے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر ملم سر راہ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا

اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ اس نے سر پر ایک سرخ بنارسی صافہ باندھ رکھا تھا۔ کبھی ملم گرد و غبار میں ہماری نظروں سے غائب ہو جاتا اور کبھی پھر اس کا بنارسی صافہ دُھندلکے کو چیرتا ہوا ہماری نظروں میں کھبنے لگتا۔

اس دن اسٹیشن پر بھیڑ تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد گاڑی آئی۔ اس کے وسط میں ایک زنانہ ڈبّہ تھا اور عورتوں کے ہجوم میں دو متجسس، سہمی ہوئی آنکھیں فکر مندی کے احساس سے پلیٹ فارم پر گھومنے والے خوب صورت سے خوب صورت، متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بدصورت، قلاش اور چڑچڑے آدمی کی جویاں تھیں۔

ملم آہستہ آہستہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا گوری کی صحت پہلے کی نسبت بہت اچھی ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لمبے سفر کی وجہ سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں چار ہونے پر وہ بے صبری کی کیفیّت نہ رہی، یا شاید وہ اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ملم نے دو ایک میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھڑیاں، گنوں کی ایک پولی اور چند اور چیزیں اتاریں اور اس کے بعد گوری بھی نیچے اتر آئی۔ چلتے چلتے بھیڑ میں گوری کسی کے

ساتھ بھڑ گئی۔ ملم نے اس واقعے کو دیکھا۔ اس کے علاوہ پل کی سیڑھیوں پر چند ایک بے کار نوجوان کھڑے گوری کو دیکھ رہے تھے، جو ایک خاص قسم کی کیفیّت میں اُڑی سی چلی جا رہی تھی۔ ملم نے غصّے سے پیچھے دیکھا اور بولا، "گوری۔۔۔" گوری نے کانپ کر ادھر ادھر دیکھا اور گھونگٹ سر پر ڈال لیا۔

اب اسے راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ملم کے دھوکے میں اس نے اپنا ہاتھ کسی اور شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ یا شاید یہ چترتی کے چاند دیکھ لینے کی وجہ سے تھا کہ ملم نے غصّے سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہ نئے ڈھنگ سیکھ آئی ہو۔۔۔ پھر آ گئیں میری جان کو دکھ دینے۔" اس وقت پُل کے پاس، ایک مریل سا کتّا ایک خوبصورت کتیا کے سامنے اظہار محبّت میں دُم ہلا رہا تھا۔۔۔

# زین العابدین

اُونگھ جانے کے عرصے بعد تک، سگریٹ کا وہ ٹکڑا، میری انگلیوں میں بے ارادہ تھما، جلا کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ جلا کیا۔۔۔۔۔

اُونگھنے کے عمل میں جو نجات کا پہلو ہوتا ہے میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ بیداری کی تلخ حقیقتوں کو کس طرح انسان خواب کے حسین بطلان میں کھوئے چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ایک دم سگریٹ کے بچھو نے مجھے دو انگلیوں کے درمیان کاٹا۔ میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ سگریٹ نے ایک لمبی جست لی اور

چٹائی پر گر کر سُلگنے لگا۔ اُسے پاؤں سے خاموش کرتے ہوئے میں نے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو ہاتھ سے چھُوا۔ چائے شربت ہو چکی تھی اور نیو جہانگیر ریستوران کا خوب صورت، ایرانی نژاد چھوکرا اور دہکتے ہوئے کوئلے، پاس پاس پڑے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہوئے سوتے سوتے، سو ہی گئے تھے۔

سرد خون والے جانور، مثلاً سکھوں کے عہدِ حکومت کی بنی ہوئی ہماری کوٹھڑی کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے پیچھے بسنے والے اسفنجی کیڑے ہزارہا چھپکلیاں اور اُن کے رینگنے والے بھائی منجمد ہو چکے تھے۔ خون کا دورہ ان کی رگوں میں سست پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوراک کے لیے بھی جدوجہد چھوڑ دی تھی۔ وہ عیّار چھپکلی جو ہر روز دبے پاؤں روشنی کے گرد طواف کرنے والے پروانوں کا شکار کرنے آیا کرتی تھی اس روز نہ آئی اور جھینگروں نے بھی تو سرِ شام ہی شور مچایا تھا جب کہ سورج کی آخری شعاعوں کی گلابی گرمی کو سردی تسخیر کر رہی تھی۔ سردیوں کے شروع میں میدان میں اُتر آنے والی ابابیل، جس نے ریستوران کے کلاک کے پیچھے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا، پر پھڑ پھڑا کر اپنے بچّوں کو اُن میں لپیٹتے ہوئے، اُن کی حرارت کو صَرف ہونے سے بچا رہی تھی۔

اس وقت میں بہت سے نرم و گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور میری تلخ یادداشت پر فراموشی کا عملِ تبخیر شروع تھا۔ اچانک سگریٹ نے مجھے جگا دیا اور آنکھیں کھُلتے ہی میری نظر چھت پر ایک بے قاعدہ دائرہ بنائی ہوئی، چارپائی کے نیچے دو سمٹے ہوئے پیروں پر جا پڑی۔ کچھ دیر، گو مگو کی حالت میں، میں ان پیروں کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک کسی خیال کے آنے سے میں نے ان پیروں کو چھُو دیا۔ چھُوا ہی نہیں بلکہ زور سے کھینچا اور چلّایا۔

"زینو کے بچّے۔۔۔۔۔"

زینو، ان پیروں کا مالک، ایک تیس سالہ ننگ پیری نوجوان، اسفنجی کیڑے کی طرح سُکڑ گیا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ چھُپ نہ سکے گا، اپنی کہنیوں کی مدد سے پیچھے کو سِرکا، اکڑوں بیٹھا، بالوں کو جھٹکے سے سیدھا کیا اور بے حیاؤں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نظریں چرانے کی بجائے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اسے کان سے پکڑا اور کھینچتا ہوا لیمپ کے پاس لے گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ عیّار چھپکلی کسی بڑے سے پروانے کو پکڑ کر روشنی کی طرف بڑھتی تھی۔

زینو کی آنکھیں آج معمول سے زیادہ خونی ہو رہی تھیں۔ بال بھی پہلے سے زیادہ منتشر تھے اور نِچلا ہونٹ لٹک کر پان خوردہ دانتوں کی سیاہی کو نمایاں طور پر دکھا رہا تھا۔ اس کے زرد، دُبلے، آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں اور اس کے چوری کے ہر روز بڑھتے ہوئے تجربے کو عیاں کر رہی تھیں۔ شاید زینو چوری کے ذریعے اپنی آمدنی کو خرچ کے برابر کرنا چاہتا تھا۔ چوری کے روپے آمدنی کو خرچ کے مساوی ہی نہیں کرتے، بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ آمدنی کم خرچ زیادہ، چہرے کے خدوخال کو نہیں بھرتے اور شاید اسی لیے چوری کا سا نیک اور پُر مُنفعت پیشہ بُرا ہے۔

میں نے قدرے سختی سے کالر کو کھینچا اور مجھے یاد آیا کہ زینو کی پہنی ہوئی قمیص میری اپنی ہے، وہی جو میں نے چند دنوں کے لیے اُسے پہننے کو دی تھی۔

گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"کیوں بے، سالے، بدمعاش، بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہو رہا تھا یہاں؟"

"میں یوں ہی پڑا تھا، میں سوتے سوتے چارپائی سے گِر پڑا تھا۔ میں چارپائی کے

نیچے آپ کے لال املی کمبل کو ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ وہی پھٹا ہوا کمبل جو آپ نے نجس سمجھ کر پھینک دیا ہے، وہی، وہی جس میں جوئیں چل گئی تھیں، یاد نہیں آپ کو؟ ہاں ہاں وہی۔۔۔" اور اس قسم کی یادہ گوئی کی بجائے اس نے اپنے سر کو جھنجھوڑا اور دوٹوک جواب دیا۔

"چوری"!

اس مختصر، جامع، نفسیات آزما جواب نے مجھے چند لمحوں کے لیے خاموش کر دیا اور میں ایک ایسی دنیا میں اُڑنے لگا، جہاں، ایمان، شرافت ایک اضافی بات ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے تجزیے سے دیانت داری اور چوری میں، کانوں کو ہاتھ لگانے اور تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا والی بات نہیں رہ جاتی۔ اس پُر نجات خاموشی کے عالم میں مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا سالا، اپنی مذموم عادت سے باز نہ آئے گا؟ کئی مرتبہ اِسے چوری کے الزام میں قرار واقعی سزا دی جا چکی ہے۔۔۔۔۔ جس طرح نیلے رنگ کا شیشہ سفید روشنی کے باقی چھ رنگوں کو جذب کرتے ہوئے نیلے رنگ ہی کو گزرنے کی اجازت دیتا ہے، اسی طرح اس کی ذہنیت بھی سب اچھی باتوں کو جذب کرتے ہوئے چوری کی طرف آزادانہ

رجوع کرتی ہے۔

”تم نے خان کا سوٹ کیس کھولا ہے؟“ میں نے اُسے آستین سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

”اگر خان دیکھ لے تو؟“

زینو کانپ رہا تھا، خوف سے نہیں، سردی سے، اور بولا۔ ”دیکھ لے تو پکڑے، اسی طرح آستین سے یا گریباں سے، جیسے آپ نے مجھے پکڑ رکھا ہے اور نہیں چھوڑتے، وہ بھی نہ چھوڑتا تو کیا بگاڑ لیتا میرا۔۔۔۔۔“

میری بات کے جواب میں زینو یہ بھی کہہ سکتا تھا، آپ ہی کی قمیص پھٹ جاتی نا۔۔۔۔۔ میرا کیا بگڑ جاتا؟ اور یوں دریدہ دہنی کے علاوہ ایک لطیفہ ہو جاتا۔ لیکن اب جو کچھ، ہو رہا تھا وہ کیا کسی لطیفے سے کم تھا، میں نے مرعوب ہوتے ہوئے اس کی آستین کو چھوڑ دیا۔ چسٹر کو اپنے گرد لپیٹا، بٹن بند کیے اور اس کے کندھے کو تھپکتے، لبوں سے ایک بوسے کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”شاباش! اللہ تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے، بیٹا“!

اور پھر پلٹتے ہوئے میں نے غصّے سے کہا۔ ”جیل خانے کی ہوا راس آئے گی تمہیں، اُلّو کے پٹھّے؟“

اسی وقت زینو نے انگلیوں کی کنگھی بنائی، اپنے منتشر بال درست کیے اور اپنے گھٹنوں سے مٹی جھاڑی۔ میری بات کے جواب میں وہ قدرے دلیری سے بولا۔

”آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اِس زندگی سے بُری ہے؟ وہاں بھی اللہ روٹی دے، اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین۔“

میں نے دل میں سوچا۔ عجب ہے اللہ! اور پھر میں نے کہنا چاہا۔ اللہ میرا بھی تو رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین مجھ پر بھی تو عائد ہوتا ہے اور بہتر طور پر، اس خان پر جس کا سوٹ کیس تُم نے ابھی ابھی ناپاک ارادے سے کھولا ہے۔۔۔

اور پھر زینو خود ہی چُپ چاپ ڈیٹ مار کی خالی پیٹی پر بیٹھ گیا۔ شاید وہ اندھیرے میں بیٹھ کر اپنی ندامت کو چھپانا چاہتا تھا۔ میں چیسٹر اور جوتوں سمیت بستر میں جا گھُسا اور ایک کونے سے اُسے دیکھنے لگا۔ زینو نہایت بے پروائی سے بیٹھا اپنے

دانتوں کی میل کرید رہا تھا۔ پھر اُس نے احتیاط سے قمیص اتاری۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوچا، زینو کو کچھ بھی کہنا بے فائدہ ہے۔ لا حاصل۔ میں نے اسے اسٹوو گرم کرنے کو کہا اور خود اُٹھ کر خان کا سوٹ کیس بند کرنے لگا۔ اسی وقت خان نے چارپائی پر پہلو بدلا، چارپائی چیخی اور میں نے کانپ کر سوٹ کیس پر سے ہاتھ اٹھالیا۔ خان اپنے پتلے سے لحاف میں سکڑ گیا، شاید خون کا دورہ اُس کی رگوں میں بھی سُست ہو چکا تھا۔

زینو کا پورا نام زین العابدین تھا۔۔۔ عابدوں کی زینت۔ لیکن چوری عجب قسم کی عبادت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے رہ گئی ہے۔ اگر ہمارا معبود حق تلفی اور زبردستی کو دیکھ کر بھی جامد رہتا ہے، اپنی تعریف سے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا یا وہ کوئی بڑا چور ہے زینو اسم بامسمی تھا۔

حقیقت میں زینو کا کوئی خاص نام نہ تھا محض اس لیے کہ سب اس سے وافر محبت کرتے تھے۔ محبت جو نفرت کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ جس میں جذبات کو دخل ہوتا ہے ادراک کو نہیں۔ زینو کا نام وقت اور جگہ کی مناسبت سے رکھ لیا جاتا تھا۔ اس مستقل نام کے نہ ہونے کا زینو کو گلہ تھا۔ لیکن شدید نہیں۔ زینو میں شدّت

کسی چیز کی نہ تھی۔ وہ کھکھلا کر ہنستا اور نہ گڑ گڑا کر روتا۔ اس کے رونے اور سننے میں تمیز مشکل سے ہوتی تھی۔۔۔۔۔ والدین شاید زینو کو ہلالِ عید، اور اس قسم کے مُشکل ناموں سے پکارتے ہوں گے بجائے اس کے کہ حرامی یا ایسے ہی کسی آسان نام سے پکارتے۔ کوٹھڑی میں بسنے والے یارانِ طریقت سب کے سب زینو کے گرویدہ تھے۔ اس لیے وہ اسے ہر دفعہ اپنے من مانے نام سے پکارتے، خان اور وحید اسے بیٹا کہہ کر بلاتے تھے۔ شریف کاتب اسے، سالا، کہا کرتا تھا اور زینو جب سے سالے کے نام پر لبیک کہتا تو شریف کو ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی۔ وہ خوشی جو گدگدی یا میٹھی میٹھی خارش کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً ایسے رشتوں سے ہی حصّے میں آتی ہے۔۔۔۔ کوئی بزعمِ خود باپ تھا اور کوئی بہنوئی، اور اس طرح بغیر کسی عورت کے وہاں ایک بڑا سا کنبہ بس رہا تھا۔

ہماری کوٹھڑی میں ایک نو مسلم راجپوت رہتا تھا۔ خان اسے تکلّف سے مہدیِ اسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس شخص کا پیشہ نقلی چیزوں پر پیٹنٹ کے لیبل چسپاں کر کے بیچنا تھا۔ مہدی اسلام، نو مسلم ہونے کی وجہ سے بہت پارسا اور نمازی تھا اور چونکہ خود تجرّد پسند تھا اس لیے زینو کو سالے کی بجائے ماموں کہہ دیا

کرتا تھا۔

زینو کی مجھ سے پہلی ملاقات ایک حادثے کی نوعیت رکھتی تھی۔ پُل پختہ کے تاریخی بلوے میں میں مجروح ہو کر ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں میرے ساتھ زینو کی چارپائی تھی۔ اسے غالباً چوری کے الزام میں پیٹا گیا تھا۔ اس کا چہرہ خاک اور دھول میں اَٹا پڑا تھا۔ ان میں سے دو آنکھیں باہر گھور رہی تھیں۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی جیب میں دو دانت تھے جو اُس نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھے تھے۔ غالباً انہی دانتوں کے سلسلے میں اُس نے مجھے بُلایا اور پوچھا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"دارالترجمہ میں نوکر ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا نوکری ہے؟"

"دبیر اوّل۔"

"دبیر اوّل کیا ہوتا ہے؟"

"ہیڈ کلرک۔ بڑا کلرک، منشی، بڑا منشی، بڑا بابو۔" میں نے ذرا وضاحت سے کہا۔

زینو جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا مایوس سا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس وقت دونوں دانت اُس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے تھے جنہیں وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے سمجھا آپ ضلع کچہری میں چپراسی ہیں؟“

میں نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟“

”آپ کی شکل سے۔“ اس نے بلا تأمّل کہا۔

میں نے خجل ہو کر سر کو گِرا لیا۔ دانت برآمد کرتے ہوئے زینو ایک رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”ان حرام زادوں نے میرے دو دانت توڑ دیے ہیں۔ اب بھلا یہ دودھ کے دانت تھوڑے ہیں جنہیں سورج کی طرف پھینک دیا جائے گا اور وہ پھر سے پیدا ہو جائیں گے۔ کیا آپ کا کوئی بخیل (وکیل) واقف ہے جو لاٹ کی کچہری (ہائی کورٹ) تک پہنچتا ہو؟ میں نے سنا ہے دانت توڑنا سرکار میں بڑا جرم ہے۔ دانت توڑنے والے سے پچاس روپے جریمانہ (جرمانہ) وصول کر کے دانت کے مالک کو دیا جاتا ہے۔ اب میرے پاس مقدمے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ

مقدمہ کر کے ان دو دانتوں کا سو روپے لے لیں اور بیس مجھے دے دیں، مجھے بڑی ضرورت ہے۔"

"بھلا اس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کیا ہو گا۔" میں نے سوچا اور پھر زینو سے بھی زیادہ گہرے راز دارانہ لہجے میں میں نے کہا۔ "سو؟۔۔۔ شاید تمہیں دو سو مل جائیں۔ ان دانتوں کو نیلام گھر میں پہنچا دو۔"

اس وقت زینو تقریباً ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے پیسوں چٹکلوں شعروں سے اور خوب صورت عورتوں کی تصویریں دکھا کر اس کے زندگی میں مٹتے ہوئے یقین کو جِلا دی۔ میری رفاقت میں وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔ میں نے اُس سے بھی ایک قدم آگے اٹھایا۔ زینو جو کہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اس کی بے کسی کا احساس کرتے ہوئے، یا دوسرے لفظوں میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر، میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن اس نے آتے ہی گوناگوں مصیبتوں میں مجھے مبتلا کر دیا۔ بارہا میں سوچتا ہوں میں نے کیا بُرا کیا جو ایک بازاری کتّے کی طرح ارزاں، ایک کیڑے کی طرح بے قیمت انسان کو قعرِ مذلت سے اٹھایا اور اپنی کوٹھڑی میں بسنے والے شریف زادوں کا نزدیکی بنا دیا۔۔۔ پھر میرا ذہن خود ہی

جواب دیتا ہے۔ تمہارا ہی تو سب قصور ہے کہ تم نے ایک کیڑے کو آستین میں رکھا، کیڑے کی صحیح جگہ گندگی ہے۔

پھر خیال پیدا ہوا اس نیک کام کے کرنے میں جذبات نے تمہیں کتنا حظ دیا ہو گا جسے تم روحانی حظ کہتے ہو۔ اس تھوڑے سے حظ کی تمہیں قیمت دینا ہو گی۔ جذبات!۔۔۔ جذبات ہمیشہ آدمی کو خرد سے مہنگے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی میرے بہت ہی قریب ہو کر پوچھے کیا تم دیرپا خرد پسند کرو گے یا وقتی جذبات کو، تو میں بلا تامّل کہوں گا۔ جذبات کو!

عادت۔۔۔۔۔۔ میں سگریٹ پیتے پیتے اونگھ جاتا ہوں اور جب انگلی جلتی ہے تو چونک اٹھتا ہوں۔ ایک دن کسی مترجم کی وفات پر دار الترجمہ میں چھٹّی تھی اور میں دوپہر ہی کو اپنی کوٹھڑی کی چھت پر دھوپ میں پڑا اونگھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بدستور سگریٹ تھا جب کہ نیو جہانگیر ریستوران کے ایرانی نژاد چھوکرے نے پیک دان لا کر میرے پیروں میں رکھا۔ ابھی سگریٹ نے میرا ہاتھ بھی نہ

جلایا تھا کہ سیڑھیوں پر دھادھم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جاگ اٹھا۔

خان، وحید، مہدی اسلام، ریستوران کا مینجر سب کے سب میرے سامنے کھڑے تھے اور چیخ چیخ کر میرے دماغ میں گھسنا چاہتے تھے۔

"میری گھڑی لے گیا ہے سالا۔" شریف نے کہا۔

"اور میری مشہدی لُنگی۔" خان آنکھیں دکھائے ہوئے بولا۔

ریستوران کا مینجر کہنے لگا۔ "تین روپے سات آنے کا بل دو ماہ سے واجب الادا ہے؟"

سب سے آخر میں مہدی اسلام بولا۔

"میرے پانچ اڑا لیے ہیں ماں کے خاوند نے۔۔۔۔۔"

مہدی نے وہ گالی ذرا وضاحت سے نہ دی تھی۔ میں نے سوچا شاید مہدی نے ماموں بھانجے کا رشتہ بدل دیا ہے اور اُسے ماں کا خاوند بنالیا ہے۔ یہ نیا رشتہ عجیب ہے۔ آخر یہ پارسا اور نمازی لوگ گالی دینے کے لطیف فن میں ماہر کیوں نہیں ہوتے۔ معمولی سی وضاحت، لفظ اپنی، کے اضافے سے ایک جامع گالی ہو جاتی۔

خیر! میں نے سب کو فرداً فرداً سمجھایا۔ وہ احمق اپنے نقصان کی تلافی مجھ سے چاہتے تھے۔ کیونکہ میں نے ہی انہیں وہاں لا کر رکھا تھا اور زینو کی سب حرکتوں کے لیے میں ہی ذمّہ دار تھا۔ یہ کیا کم رعایت تھی کہ زینو سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا اور اسے دار الامان (ہماری کوٹھڑی کا نام) میں پناہ دی جاتی تھی، شاید وہ سب لوگ مجھ سے بہت نامناسب سلوک کرتے اور لڑائی کی صورت میں تو شاید ایک ایک، دو دو ہڈّیاں ہی اُن کے حصّے آتیں لیکن میں نے ضامن بنتے ہوئے کہا کہ اگر زینو شام تک نہ لوٹا تو میں یکم کو سب کا نقصان چُکا دوں گا۔ ان سب کو یکم کی بندش پر اعتراض تھا۔ میں نے دراصل سوچ رکھا تھا کہ بالفرض زینو شام تک لوٹا تو میں بھی یکم میں جمعہ جمعہ آٹھ۔۔۔۔ پورے آٹھ دن پڑے ہیں۔ اور میرے رفیق مجھے کم از کم اتنی رعایت تو دے سکتے ہیں کہ زینو کے یکم سے پہلے پہلے آجانے پر مجھے چھوڑ دیں۔

اس کے بعد میں "ٹوٹا ہوا دل" دیکھنے کے لیے سنیما چلا گیا۔ جب رات کے دس بجے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ خان کی لنگی کھونٹی پر ٹنگی تھی اور شیشم کی تپائی پر شریف کی گھڑی رات کے سنّاٹے میں ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ کونے میں میرے

سویڈ کے بوٹ رکھے تھے جو میں نے چند دن ہوئے بالکل نئے خریدے تھے اور انہیں ابھی تک گھِس جانے کے خوف سے نہیں پہنا تھا اور اپنے پرانے جوتوں کو لگاتار استعمال کر تا رہا تھا۔ اب وہ وہاں کیچڑ میں لت پت پڑے تھے اور اژدھے کی طرح مُنہ پھاڑے ہوئے تھے۔ غالباً زینو انہیں بھی پہن گیا تھا جس کا مجھے علم ابھی تک نہ ہوا تھا۔ اپنے بوٹوں کے یوں خراب ہو جانے پر میں بہت خشمگیں ہوا۔ میں نے وحید سے کہا۔ ”وحید! اس کا مطلب ہے زینو آ چکا ہے واپس۔“ وحید نے ایک پرانی سی جنتری، جس کی وہ ورق گردانی کر رہا تھا نیچے پٹخ دی اور کونے میں رکھی پیٹی کی طرف اشارہ کیا۔

کونے میں زینو بیٹھا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ مٹی سے اٹا پڑا تھا اور اس کے نیچے کا لب بُری طرح لٹک رہا تھا۔ میں نے اُس وقت بھانپ لیا کہ 'تعلق داروں' نے مل کر اُسے بُری طرح سے پیٹا ہے۔ آج میں بھی اس بوہیمین کو پیٹنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے میرے سویڈ کے بوٹوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ میں نے اُسے گردن سے پکڑا اور ہمیشہ کی طرح لیمپ کے نزدیک لاتے ہوئے پوچھا۔

”ابے تو میرا بوٹ پہن گیا تھا، کس نے اجازت دی تھی تجھے؟“

لیکن زینو نے میری طبیعت کے کمزور مقام کو پالیا تھا جیسے خطرے کے وقت جانور عقلِ حیوانی سے اپنے بِل کو پالیتے ہیں۔ وہ اپنے سیدھے سادے لفظوں سے مجھ میں ایسے جذبے بیدار کر دیتا کہ میرے ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رُک جاتے۔ وہ بولا۔

"آپ لوگوں کو خیال ہی نہیں آتا۔ جب آپ بوٹ پہنے ہوئے پھریں اور میں اتنی سردی میں ننگے پاؤں پھروں تو یہ کیا انسانی (انسانیت) ہے، دیکھو تو میرے پاؤں کیسے سوج رہے ہیں۔"

اور زینو اپنے ننگے پاؤں دکھانے لگا۔ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے اور سوجے ہوئے تھے۔ ایڑیوں اور تلووں پر آوارگی اور مصائب کے ایک لمبے چوڑے نقشے کے کنٹور تھے جس میں زمانے کے ترقّی پسند مصوّر نے خون کے دریا بنائے تھے۔ میں نے زینو کی گردن چھوڑ دی اور بوٹوں کو پاؤں میں پہن کر دیکھا۔۔۔ میرے سویڈ کے بوٹ دو انگشت کے قریب کھُل چکے تھے اور کیچڑ میں بھیگ کر ایک گدھ کی نعش کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

بالکل ایک ہی کمرے میں کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان چسٹر میں لیٹا رہے اور دوسرا اُس کے سامنے سردی سے اکڑا کرے؟ ایک انسان کے پاؤں سردی

سے پھٹ جائیں اور دوسرا نرم و گرم موزے زیبِ تن کرے۔ ایک انسان گرم گرم چائے، کافی یا برانڈی پی کر وقت، مقام اور اضافیت کے جدید نظریوں پر بحث کرے اور دوسرا اُن باتوں سے بے بہرہ ایک کونے میں دُبکا ہوا شدّت کی تنہائی اور اجنبیت محسوس کرتا رہے؟ ایک شخص کے پاس ہوس رانی کے لیے وافر روپیہ پیسہ ہو اور دوسرے کو اِن سے محروم رکھ کر اُس میں جنسی عیوب پیدا کیے جائیں۔

ان دنوں میرے ہاتھ نفسیات کی ایک کتاب آئی اُسے پڑھ کر میں نے زینو کی اس قبیح عادت کے ہر پہلو پر غور کیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا کہ زینو کی اس فطرت کا باعث محرومی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بچپن ہی سے اُسے ہر چیز ہر نعمتِ زندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ علم، تہذیب، مذہب، شرافت اور قانون کی آڑ میں اُس کے قدرتی حقوق غصب کیے گئے ہیں۔ اسی لیے وہ چوری کرتا ہے۔ دوسروں کے بوٹ، لنگیاں، گھڑی اور سویڈ کے بوٹ پہن کر عورتوں کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے، اور اب چوری ایک دیرینہ بیماری کی طرح جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس کے انسداد کے لیے کتنی اکسیر کی ضرورت ہو گی، کتنا کام زیرِ زمین کرنا پڑے

گا۔ کتنا وقت درکار ہو گا اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے۔۔۔۔۔۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بوٹ میں زینو کو دے دوں گا، دو انگشت تو وہ پہلے ہی کھُل چکے ہیں۔ ان کا مجھے فائدہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سوا پانچ روپے میں کھر دراسا خاکی پیٹی کا کوٹ زینو کے لیے خریدا تاکہ وہ سردی سے نہ کانپے بلکہ تن کر میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے اور میں چپکے سے سہ جاؤں۔۔۔۔۔ جذبات ہی تو ہیں۔

میں خراماں خراماں گھر کو لوٹ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہو گا۔ وہ مجھے کیسا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا۔ مجھ سے لپٹے گا۔ کہے گا اللہ تمہیں ایک خوب صورت بیوی دے۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین۔۔۔۔

میں نے "دار الامان" میں قدم رکھا۔ زینو اسی طرح ایک اسفنجی کیڑے کی مانند سکڑ کر ایک کونے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا آج شاید پھر اس غریب الدّیار کو کسی نے مارا ہے۔ میں ان جذبات سے کورے عقل مند وحشیوں کو اس کی اچھی طرح سزا دوں گا۔ میں ان لوگوں کو اب بھی خرید سکتا ہوں۔ زینو کے ان سے تمام

رشتے ناطے توڑ سکتا ہوں۔ لیکن نہیں زینو کو کسی نے نہیں پیٹا تھا۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے زینو کو کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ یہ حرکت میں نے اس وجہ سے کی کہ زینو سمجھے گا کہ آج پھر مجھے کسی جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے اور اس شک و بیم کے درمیان جب اسے پتا چلے گا کہ اسے کوٹ اور بوٹ بخشش میں دیے جا رہے ہیں۔ تو اس ڈر کے مقابلے میں خوشی کتنی ہولناک طور پر خوب صورت ہو گی۔

میں نے زینو کے کانوں کو اچھی طرح سے مروڑا۔ درد کے ایک احساس سے وہ آہستہ سے کراہ اُٹھا۔ لیکن اس نے مطلق نہ پوچھا کہ وہ سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ اب کانپ رہا تھا۔ سردی سے نہیں خوف سے، کیوں کہ اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو بیٹا، تیرے لیے کوٹ لایا ہوں۔“

ایک لحظہ میں زینو کا خوف دور ہو گیا۔ وہ میرے قریب سِرک آیا اور کھوکھے کی پٹی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی فرشتہ بیٹھتے وقت

اپنے پَر سنوارتا ہے۔ اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''وہ بوٹ بھی اب تمہارے ہیں۔''

زینو مسکرایا، بالکل خفیف طور پر، اس نے چسٹر مجھ سے لے لیا اور اُسی وقت اسے کندھوں پر ڈال لیا اور بولا۔

''میں جانتا تھا! تم میرے لیے کوٹ لاؤ گے۔۔۔۔۔ تم مجھے بوٹ دے دو گے۔ یہ بھی جانتا تھا۔''

اور اس کے بعد وہ کوٹ کے بٹن احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنی چٹائی پر جا لیٹا۔ مجھے اس کی ناشکر گزاری پر سخت غصّہ آیا۔ میں نے دل میں کہا۔ آئندہ میں زینو پر ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ اس کا فائدہ ہی کیا؟ اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد جب میں خان کے ساتھ چارپائی پر لیٹا تو مجھے غصّہ کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خیال رینگتا ہوا میرے ذہن میں آیا۔ کیا اس کے بعد شکر گزاری کی ضرورت ہے؟ گویا کیڑے کو گندگی میں سے اُٹھانے اور ڈنک سہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک خاص قسم کا حِظ محسوس

ہوا۔ جیسے کوئی مجھے کوٹ اور بوٹ کی قیمت ادا کر رہا ہو!

ایک دن میرا ایک مترجم دوست میرے پاس آیا۔ میں نے اُس سے زینو کا تذکرہ کیا اور خاص طور پر زینو کو کوٹ اور بوٹ مہیّا کرنے کا واقعہ سنایا۔ اس نے میرے جذبات کو سراہا۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور میرا رواں رواں شدّتِ احساس سے جاگ اُٹھا۔ میرے دوست نے بتایا۔ زینو کی چور ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے اُس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں دیا گیا جسے وہ آزادانہ خرچ کر سکے۔ ایک کوٹ یا چسٹر کی بجائے اُس کے ہاتھ میں کچھ نقدی دینا بہتر ہو گا۔ ایسی نقدی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکے۔

اس کے بعد وہ مترجم رخصت ہوا اور میں نصف شب تک اس بات پر غور کرتا رہا۔ اگلی صبح میں نے زینو کو پاس بلایا اور ایک روپیہ اُس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

”زینو، بیٹا۔۔۔۔۔۔ لو یہ خرچ کر لینا۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔۔۔۔ جب ختم ہو جائے تو میں تمہیں اور دوں گا۔“

اس دن میری طبیعت نہایت پُر سکون رہی۔ شام کو آیا تو میں نے باتوں باتوں میں روپے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ زینو روپیہ کتنی احتیاط سے خرچ کرتا ہے۔ لیکن شام سے پہلے پہلے زینو نے وہ روپیہ ختم کر ڈالا تھا اور دو روپے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ جب میں نے جیب میں سے دوسرا روپیہ نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اگر اس حساب سے روپے خرچ ہونے لگے تو دیوالے کی درخواست دینی پڑے گی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا گویا خرد بہ بانگ دہل کہہ رہی تھی۔ "اب کہو؟"

لیکن میں نے خرد کو جذبات پر غالب نہ آنے دیا۔ میں نے جوشِ عمل کے جذبے سے ایک روپیہ نکالا اور کہا۔

"زینو۔۔۔۔۔ لو ایک روپیہ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ بس میں ایک ہی دے سکتا ہوں لیکن یوں گزارہ نہ ہو گا۔ احتیاط سے خرچ کرنا؟"

اس کے بعد جب میں شام کو دفتر سے لوٹا تو زینو پہلے سے موجود تھا۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے روپیہ میرے سامنے پھینک دیا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ بولا۔

”کیوں زینو؟“ میں نے پوچھا۔

”جب تک پیسہ میری جیب میں رہتا ہے۔“ زینو بولا۔ ”مجھے سکون میسر نہیں ہوتا۔ گویا وہ میری جیب سے اُچھلا پڑتا ہے۔ جب تک اِسے خرچ نہ کر ڈالوں۔ مجھے بہت کوفت ہوئی ہے۔۔۔۔۔“

میں نے سخت تذبذب میں روپے کو ہاتھ میں تھامے رکھا اور لیمپ کے گرد طواف کرنے والے ایک پروانے کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات تھی۔ زینو کو ایک روپے کو خرچ کرنے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ ایک روپیہ جیب میں ڈال کر اسے خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ لذیذ ترین مٹھائیاں، خوب صورت ساڑیوں میں ملبوس عورتیں اور کیا کچھ نہیں خرید سکتا۔ گویا وہ ایک چھوٹا برتن ہے جس میں زیادہ چیز نہیں سما سکتی۔ وہ ایک روپیہ بھی جیب میں نہیں رکھ سکتا اور جب اس کی جیب خالی ہو گی تو وہ چوری کرے گا۔ اس پر ایک جمود طاری ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ لیکن کیا مجھ سے زیادہ جذباتی آدمی بھی کوئی ہو گا جو اسے ہر روز ایک روپیہ دے سکے۔۔۔۔۔ جذبات۔۔۔۔۔ جذبات جو کہ چوری سے بھی زیادہ جمود انگیز ہیں۔

چوری سے زینو کو روکنا بے سود سمجھ کر میں نے اس ضمن میں اسے کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

اسی شہر کے محلہ قاضی عبد الغفار میں میری ہمشیرہ رہتی ہے۔ میرے بہنوئی محکمہ ڈاک میں ایک اچھی گزارے کے لائق آسامی پر متعیّن ہیں۔ میری ہمشیرہ کے تین بچّے اور دو مکان ہیں۔ شہر میں میرے بہنوئی کا کافی رسوخ ہے۔ کچھ دنوں سے میں شادی کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میں تیس برس کا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سے گرم ملک کا باشندہ تھا اور کثرت سے چاٹ کھانے کا عادی۔ شروع جوانی میں پھوپھی اور خالہ کے ہاں کے رشتے آئے تھے۔ مگر مجھے ان دونوں لڑکیوں سے کچھ چِڑ تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں خوب صورت اور بے وقوف تھیں۔ اس کے بعد ہمشیرہ کہنے لگی۔ وقت گزر چکا ہے اور اب تو میرے سر میں کہیں کہیں سفید بال دکھائی دینے لگے تھے۔ ہندوستان کی اوسط عمر سے زیادہ ہو چکا تھا اور یہی کیا کم غنیمت تھا لیکن میں ایک عورت کی شکل دیکھے بغیر ہی مر جاتا تو کیا جنّت کے دروازے مجھ پر کھلے رہتے؟ میں نے ارادہ کیا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعے شادی کے متعلق کہلا بھیجوں اور جب ہمشیرہ تھوڑا سا بھی

اصرار کرے تو مان جاؤں، آخر کھانا پکانے کے لیے بھی تو ایک عورت چاہیے۔ گویا میں سارا دن مردانے میں بیٹھا رہوں گا اور بیوی باورچی خانے میں۔

اور دل کہہ رہا تھا۔ دار الامان کی جگہ المنظر کی ضرورت ہے، زینت خالہ کی لڑکی خوب صورت ہی سہی۔ بے وقوف ہے تو بے وقوف ہی سہی۔ باورچن تو اچھی ثابت ہو گی۔

اس کام کے لیے میں نے جس معتبر شخص کو ڈھونڈا وہ زینو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ زینو کافی عرصے سے میری ہمشیرہ کے ہاں متعارف تھا۔ دیر سے حاجی بگوئم پا جی بگوئم کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے زینو کو رضا مند کیا کہ وہاں پہنچ کر میرے لیے زمین تیّار کر دے۔ میری شادی کا تذکرہ چھیڑے۔ ہمشیرہ جو مدّت سے میرا گھر آباد دیکھنے کی خواہش مند ہے، مجھ سے خود ہی اصرار کرے گی اور پھر میں زینب کا قصّہ چھیڑ دوں گا۔

ایک نیک ساعت دیکھ کر میں اور زینو گھر پہنچے۔ ہمشیرہ قریب آکر بیٹھی تو میں عمداً کسی بہانے سے وہاں سے چلا گیا۔ دراصل میں بغل کے دروازے کے پاس کھڑا سب کچھ سنتا رہا۔ زینو کہہ رہا تھا۔

”ان کی شادی کیوں نہیں کر دیتے آپا؟“

”مانے بھی۔“ آپا بولیں۔

”اصرار بھی تو نہیں کیا آپ نے کبھی۔“

”اصرار کی خوب کہی تم نے۔“ ہمشیرہ غالباً ہاتھ پھیلا کر بولی۔ ”اس ڈھیٹ آدمی نے پھوپھی اور خالہ کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اب تو میں اُسے کبھی نہیں کہنے کی۔“

میں تلملا کر رہ گیا لیکن میرا ہونہار وکیل کہنے لگا۔

”بچپن تھا نہ آپا اس وقت تو۔۔۔۔۔“

ہمشیرہ غالباً ایک چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتی ہوئی بولی۔

”میں تو کبھی نہ کہوں گی، تم منالو اسے۔۔۔۔“

میں موقع مناسب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر تصویروں پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ہمشیرہ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بولی۔

"پی لو ایک پیالی۔" اور پھر بولی۔ "شادی کے متعلّق کیا خیال ہے تمہارا؟"

ضروری تھا کہ ہمشیرہ کے سامنے میں جھوٹا سچّا انکار کرتا۔ میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "شادی؟ توبہ! توبہ! میں اس راہ بھٹکنا نہیں چاہتا، میرا مطمحِ نظر شادی سے کہیں بلند ہے۔"

زینو نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "اور باورچن؟"

میں نے چِلّاتے ہوئے کہا۔ "بکواس بند کرو، زینو کے بچّے، جہانگیر ریستوران میں بُرا کھانا ملتا ہے کیا؟"

اب جو کچھ زینو نے کہا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا اور مجھ سے مانگ کر پہنی ہوئی پتلون کے گیٹس کو کھینچے ہوئے بولا۔

"ایسے بے ڈھب انسان مجھے بالکل پسند نہیں۔ خود ہی مجھے تیّار کیا کہ میں جا کر شادی کے لیے زمین تیّار کروں اور اب مجھے ہی خجل کرنا چاہتے ہو کیا؟"

زینو جتنا خجل ہو سکتا تھا ہو چکا تھا اب میری باری تھی۔ پسینے کے قطرے اتنی

سردی کے باوجود میری پیشانی پر پیدا ہو گئے۔ میں ہمشیرہ کے سامنے برابر انکار کرتا رہا مگر اس سے کیا ہوتا ہے، میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا زیادہ سے زیادہ میں نے یہ کیا کہ ننھے بھانجے کو گودی میں اٹھالیا اور بہنوئی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کس کے ابّا ہیں؟ تمہارے؟ ارے تھوکتے ہو؟ اے یو! کتنے گندے ہو تم؟"

اور پھر ہمشیرہ سے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

"یہ بھی کہتا ہو گا، اچھا ماموں ہے میرا۔ بالکل خالی ہاتھ چلا آیا۔"

اور اپنے بھانجے کے گالوں کی چٹکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"اب کی دفعہ میں تمہارے لیے چیری لاؤں گا۔ چیری، اور ٹافی۔۔۔ کیا تم نے کبھی ٹافی بھی کھائی ہے؟۔۔۔۔۔۔ ٹافی چیری سے بھی زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔"

میری ہمشیرہ مُسکراتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے رُخصت لی۔ راستے میں میری زینو سے خوب لے دے ہوئی۔ میں نے کہا۔ "تمہیں دارالامان میں چل کر پیٹوں گا سالے۔" گویا پیٹنے کے لیے دارالامان سے زیادہ موزوں اور کونسی جگہ ہو سکتی

ہے۔ میں پراگندہ دل کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اپنی بید کی چھڑی تلاش کرنے لگا۔ وہاں مہدی اسلام ہمارا انتظار کر رہا تھا اور وہ بید کی چھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پتا چلا کہ زینو نے مہدی کا پین چرا کر اُس کی نِب صراف کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، یہی چار آٹھ آنے لے لیے ہوں گے۔ مقتول قلم کا جسم نالی میں سے ملا۔ بے چارے کے سر سے نیلا نیلا خون بہہ رہا تھا۔ زینو کی قمیص کی جیب میں سیاہی کا ایک بڑا سا دھبّہ چوری کا شاہد تھا۔

اس دن میں نے دونوں باتوں کے لیے زینو کو پیٹا اور کہا۔ "نکل جاؤ سور کے بچّے۔۔۔۔ شہدے، حرام زادے نکل جاؤ فوراً یہاں سے۔"

اسی وقت میں نے زینو کو سیڑھیوں میں سے دھکا دیا۔ دو چار سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر جا رُکا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد زینو اُٹھا اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اسے کسی بات پر یقین نہ آتا ہو۔ جب وہ کچھ دور جا کر میری جانب دیکھنے کے لیے رُکا تو اس خوف سے کہ کہیں وہ اپنی عقل حیوانی سے مجھ پر فتح یاب نہ ہو جائے، میں نے دیوار کے قریب سے ایک اینٹ اٹھائی اور زینو کی

ٹانگ پر دے ماری۔ زینو کی چیخ ریستوران تک سنائی دی اور وہ بلبلاتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اور اینٹ پھینکی، زینو لنگڑاتا ہوا اُٹھا اور اسی حالت میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ شام کے بے مہر منجمد اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔

اس سخت سردی کی رات میں جب کہ جھینگر بھی سرِ شام ہی سے شور مچانا چھوڑ دیتے ہیں میں اپنے بستر میں لیٹا، اس کی نرمی گرمی محسوس کرتا ہوا سوچتا ہوں۔ میرے سینے میں دل حرکت کرتا ہے۔ میری قوت متخیلہ بڑی بُلند بین ہے۔ جب وہ ریل کی لائنوں، یا دریا کی گہرائیوں کو ناپتی ہے، تو یہ دل شدّت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جب شریف کاتب جغرافیے کے ایک کورس کی کتابت کرتا ہے تو مجھے وہ لفظ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ زمین اپنے محور کے گرد حرکت کرتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، کیا عجب جو وہ ساکن ہو جائے اور جب کتاب کے ساتھ نقشہ دکھائی دیتا ہے تو میں حیرت سے پوچھتا ہوں یہ کس زمین کے کنٹور ہیں؟ یہ ہلکے ہلکے، پتلے پتلے دریا جو نیلے رنگ میں دکھائے گئے ہیں ان کا قدرتی رنگ تو سُرخ ہے۔

یہ مصنّف کتنی سنجیدگی کے ساتھ وقت، مقام اور اضافیت کے متعلّق باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ سخت سردی میں منجمد ہو جائیں گے اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارا ایک معبود ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے تو اس وقت مجھ پر جنون کی کیفیّت طاری ہو جاتی ہے۔ میں دار الامان کے اندر بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتا ہوں اور کہتا ہوں۔ میں کیوں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے باورچن کی زیادہ ضرورت ہے یا زینو کی۔

خان کی مشہدی لنگی شب و روز کھونٹی پر لٹکی رہتی ہے اور شریف کی گھڑی صبح و شام تپائی پر پڑی ٹِک ٹِک کرتی ہے۔ جہانگیر ریستوران کا بِل ادا کیا جا چکا ہے۔ فونٹین پن کے پیسے بھی چکا دیے گئے ہیں۔ لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے۔ لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے جسے اپنے پیسے کی رتّی بھر بھی پروا نہیں۔

بھولے سے اپنا سوٹ کیس کھولتا ہوں تو مجھے فوراً ہی اسے بند کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے کونے میں دو دانت پڑے ہیں اور ایک کونے میں سفیدے سے لکھا ہے۔ زین العابدین یعنی عابدوں کی زینت!

کل ہی میں نے فلیکس کا ایک نیا بوٹ خریدا ہے۔ جب میں اسے پہنتا ہوں تو وہ چیختا ہے، چلّاتا ہے۔ بھلا اُسے کس بات کا رونا ہے؟ نئے چمڑے کا ہے نا، اور وہ کم بخت چیسٹر بھی تو میرے بھاری جسم پر پورا نہیں

آتا۔

جب ہم شام کو سوٹ پہن کر دار الامان سے نکلتے ہیں تو ہم کتنے بہتر انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ہم سُنتے ہیں لیکن تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ آخر والدین نے ہمیں تربیت دی ہے۔ ہم مفلر کو گلے میں اور موزوں کو پاؤں میں خوب کھینچتے ہیں تاکہ سردی لگ جانے کا خدشہ نہ رہے اور جب کوئی سڑک پر جاتی ہوئی لڑکی ہماری طرف دیکھتی ہے تو ہم فوراً اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں شریف وحید کو سالا کہہ دیتا ہے۔ وحید پورے زور سے ایک چپت اُس کے منہ پر جما دیتا ہے اور ایک ہفتہ تک وحید مستری کی ہتھوڑے پکڑنے والی انگلیوں کے نشان شریف کے گالوں پر دکھائی دیتے ہیں اور جب ہم اپنے ارد گرد غور سے دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں، نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ بیٹا،

بہنوئی ہے نہ سالا، ماموں ہے نہ بھانجا، گویا سب رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں۔

اللہ! تمام دنیا یکسر شریفوں کی دنیا میں بدل چکی ہے۔ گویا ہم ایک دار القرار، بلکہ اس سے بھی اوپر ایک خلدِ بریں میں رہتے ہیں!

# لاروے

میرے جھونپڑے کے باہر سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے، جسے گذشتہ ہفتے کی رات کو بارش نے بھر دیا ہے۔ بالکل ایک چھوٹے سے دل کی طرح، جس میں جذبات کے مدّو جزر پیدا ہوتے ہیں۔ اس گدلے پانی والے گڑھے میں بھی لہریں اٹھتی ہیں، اپنے محدود ساحلوں سے ٹکراتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں اپنے گھر کے پاس، بانسوں کے ایک ٹھنڈ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو

جاتا ہوں اور اس گڑھے میں ملیریا کے جراثیم سے بھرے ہوئے گندے پانی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ اسے ہلا کر اس میں کیچڑ کے بادل پیدا کرتا ہوں اور دال بگھارتی ہوئی عزیزہ کو آواز دیتے ہوئے کہتا ہوں۔ ”عزیزہ! اگر یہ گڑھا ایک خوبصورت جھیل ہوتا تو کیا ہوتا؟“

عزیزہ حسب معمول ایک سوکھی سی ہنسی ہنستے ہوئے میری بات کو دہرانے ہی پر اکتفا کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں اگر یہ گڑھا نیلے پانی کی ایک خوبصورت جھیل ہوتا تب بھی شاید عزیزہ کے دل کی دھڑکن ویسے کی ویسی رہتی۔ لیکن اس کے باوجود جھیل کا خیال آتے ہی میرے دل کا تمام، جراثیم سے پٹا ہوا، گدلا پانی متحرک ہو جاتا ہے اور میں جذبات کے ڈونگے پر بیٹھا ہوا پانی میں بہت دور نکل جاتا ہوں۔ غالباً چاندنی رات ہوتی ہے اور میں وحشیانہ انداز سے گاتا ہوں۔ او مری چاندنی راتوں کے خدا۔ اس وقت مجھ پر لی پو کی سی مجنونانہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور میں خوشی اور روشنی کے ہر پرتو کو خوشی اور روشنی سمجھ کر جھیل کے وسیع پانیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ کاشمیری ڈل کے تمام وہ نظّارے میرے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں، جو میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ البتّہ ہر سال دیکھنے کا تہیّہ کرتا

ہوں لیکن یا تو سرکاری حکم کی تعمیل میں بندوقوں والی بارکوں کا ٹھیکہ ختم کرنا ہوتا ہے اور یا میرا مختصر سا اثاثہ عزیزہ کی دھڑکن کے علاج میں ختم ہو جاتا ہے۔

بارش کے بعد چوماسا ہوتا ہے اور چوماسے کے بعد بارش۔ بارش چوماسے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور چوماسہ بارش کا پیش خیمہ۔ حتیٰ کہ یہ دونوں شوریدہ سر بچّے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گھر سے بہت دُور نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد دھوپ رہ جاتی ہے اور نام اللہ کا۔ کچھ دن تک تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ نام اللہ کا بھی نہیں رہا۔ فقط دھوپ ہی دھوپ رہ گئی ہے اور اس عالم میں ننھا بھوراسائیس، بلا چاچا، پریتم داس آنریری مجسٹریٹ اور چھپر کھٹ کے پینڈے میں لگی ہوئی عزیزہ، کسی کو توقع نہیں ہوتی کہ ذخیرے کے پیپل اور لہسوڑے مل کر تالیاں بجائیں، اور نہ ہی کسی کو شیشم سے گرتے ہوئے پتّوں کے لیے نوحے کی توقع ہوتی ہے۔ نباتات، چرند و پرند خاموش، انسان و حیوان خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے قدرت کے ممتحن نے ان سے کوئی نصاب سے خارج سوال پوچھ لیا۔ اس وقت پریتم داس کا ہیبت ناک ڈنگو (کتّا) اور میں، دونوں زبانیں باہر نکالے ہوئے اس گڑھے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گڑھے میں بارش نہیں، اس کی حسین یاد باقی

رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ بہشتی خیال آتا ہے۔ کبھی بارش ہوئی تھی، کبھی بارش ہو گی۔

ایک شام، بارکوں کے لیے پھوس لدوا چکنے کے بعد جب میں اس گڑھے کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ گڑھے کے پانی میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے دُم دار مینڈک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیر رہے تھے اور گڑھے کے ساحلوں پر لا تعداد لاروے چمٹے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی لاروا یک لخت اپنے سمندر کے ساحل کو چھوڑ دیتا اور لاپروایانہ، کھلنڈرے پن سے اپنی دم کو سر کے ساتھ لگاتا، چھوڑتا ہوا بہت دور تک پانی میں نکل جاتا اور گڑھے کی تہہ میں اگی ہوئی نباتات میں بسنے والے کرمکوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پھر اپنے ٹھکانے کو لوٹ آتا۔ دُم دار مینڈک ان ننّھے مُنّے جھانجوں کی طرح، بے ڈھنگے انداز سے قلابازیاں کھاتے ہوئے، کبھی سطح پر چلے آتے اور کبھی تہہ میں بیٹھ جاتے۔

میں نے اسی ٹھنڈ پر کھڑے ہو کر ان جھانجوں کی ناقابلِ فہم حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر کیا چیز انہیں بظاہر بے مقصد اور بے معنی طور پر اُوپر سے نیچے

اور نیچے سے اُوپر تیرنے کے لیے مجبور کرتی ہے؟ کون سے ریاستی رازوں کو سینے میں لیے، کون سی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے یہ اپنی بستی کو چھوڑتے ہیں، پھر لوٹ آتے ہیں؟ پھر خیال آتا ہے شاید یہ لاروے، یہ جراثیم، یہ دُم دار مینڈک پراگندہ خیالات ہیں جو گڑھے کے دل میں اٹھتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آتا ہے کہ کل ڈھولن کی بڑی بٹو میری طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی، اپنی انگلیوں سے سامنے کے قصاب خانے کی دیوار پر کوئی نشان بناتی تھی۔ جی ہاں، اس قسم کا خیال بھی تو ایک لاروا، ایک دُم دار مینڈک ہی تو ہوتا ہے جو اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز سے تیرنے کے لیے دل کے ساحل کو چھوڑ دیتا ہے اور پانی میں بہت دور، موتھے اور فضول نباتات کے آبی مرغزاروں میں ہوتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب یاد آتا ہے کہ ننھے بھورے سائیس نے میری گذشتہ ماہ کی اٹھنّی مار لی ہے، تو میں اسے نقصان پہنچانے کے ہزاروں منصوبے گانٹھتا ہوں، لیکن محسوس کرتا ہوں کہ یہ خیال بھی ایک جھانجا ہے جو کہ تیرتا ہوا دور پانی میں نکل جاتا ہے، لیکن پھر ساحل کو آ چمٹتا ہے۔ گویا ساحل اس کے لیے محض ایک منزل نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت

ہے۔ بالکل ایک ایسی حقیقت ہے، جیسے میرے منہ پر خشخشی داڑھی ہے اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس داڑھی کو دیکھ کر ڈھولن کی بڑی بٹو کبھی پسیج نہیں سکتی۔ کبھی قصاب خانے کی دیوار پر اپنی انگلیوں سے نشان نہیں بنا سکتی۔ ایسے ہی جیسے میرا تمام اثاثہ عزیزہ کی ایک فضول، دیرینہ بیماری پر ختم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے میں کشمیر دیکھنے کے ناپاک ارادے کو دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، گڑھے میں اور کثافت پیدا ہوتی گئی اور اس میں مزید انڈے اور لاروے پیدا ہوتے گئے۔ مجھے ان بد زیب، بے ڈول، نامکمل جھانجوں سے ایک قسم کا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان کے لیے اپنے دل کے کسی کونے میں محبّت کا جذبہ پانے لگا۔ ایسا ہی محبّت کا جذبہ، جو میرے دل میں، اپنے بڑے بیٹے فخرو کے لیے پیدا ہوتا ہے، یا اپنی شیر خوار بچّی خالدہ کے لیے۔ اس گڑھے میں ملیریا کے خطرناک جراثیم پل رہے تھے۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ نہ صرف آنریری مجسٹریٹ اور ننھے بھورے کو ملیریا ہو جائے بلکہ مجھے، عزیزہ اور میرے سب بچوں کو یہ بیماری لاحق ہو۔

مجھے ان لاروؤں سے ایسے ہی اُنس تھا، جیسے کہ مجھے اپنے پراگندہ خیالات سے
محبّت تھی۔ اب بھی جب کبھی صبح کو ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں چارپائی پر لیٹا ہوا
اپنے پراگندہ خیالات کی مدد سے دنیائے حقیقت کے تمام ناممکنات کو ممکنات
سے ہم کنار کر دیتا ہوں۔ مثلاً سوچتا ہوں کہ ٹھیکے کے سامنے کوٹھی میں بسنے
والے سیمنٹ کے بادشاہ کی نوجوان لڑکی خود بخود میرے پاس چلی آئی ہے۔ یا آج
میں نے بڑے سردار صاحب کی جیبوں سے نوٹوں کے تمام بنڈل اُچک لیے ہیں
اور عزیزہ کو ساتھ لیے ایک کار میں بیٹھا کشمیر کی طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ اب
کشمیر کے نشاط باغ میں ہوں۔ میں اور عزیزہ بڑے بڑے سرخ ''گلاس'' جو کہ
ڈاکٹر نے اس کے لیے مفید بتلائے ہیں، کھا رہے ہیں۔ ہماری ٹانگیں پانی میں ہیں
اور برفانی پانی ہمارے پاؤں کو چھوتا ہوا دور کسی نامعلوم جگہ کی طرف جا رہا ہے
اور جس طرح میں اپنے دل کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتا
ہوں، اسی طرح اس گڑھے میں لاروؤں کو تیرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اب جب کہ گڑھے کا پانی سوکھتا جا رہا تھا میں سوچنے لگا، ان نرم نرم جھانجوں اور
ان مدبّر مینڈکوں کا کیا ہو گا؟ کیا یہ چوماسا کبھی ختم نہ ہو گا؟ ایک دن گڑھے کا پانی

سوکھ جانے سے یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ جیسے میرے دل کی آبیاری نہیں ہوتی، کیااس گڑھے کی آبیاری بھی نہ ہو گی؟ میں ہر روز آسمان کے کسی کونے میں لٹکے ہوئے بادل کو دیکھا کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا بادل، بادلوں کی ایک فوج کے ہراول میں آتا ہے۔ لیکن اس دن کمیٹی کا داروغہ اس گڑھے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے قریب پڑے ہوئے کنیر کے پتّوں سے اس گڑھے کو ڈھانپنے کی کوشش کی۔ لیکن مکھّی کی طرح صفائی کا داروغہ بھی طبعی طور پر غلاظت کے تمام اڈّوں سے واقف ہوتا ہے، اور اس داروغہ کو بھی اس گڑھے کا علم تھا۔ اس کے ساتھ رامو کہار، ایک خاکروب، دو نوجوان، نو ملازم ہیلتھ وزیٹر۔۔۔ انسانی تہذیب کے لاروے بھی آرہے تھے۔ وہ لوگ اس گڑھے میں لال دوائی پھینک کر تمام جراثیم ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے فخرو کو مار ڈالنا چاہتے ہو، میری خالدہ کو زہر دینے آئے ہو۔ لاؤ تمہارا کام میں آسان کیے دیتا ہوں۔ میں ملیریا کے تمام اڈّوں سے واقف ہوں اور پختہ پُل کے رقبے میں جراثیم کو تباہ کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی آپ کا ممد و معاون ثابت نہ ہو گا۔

نوجوان ہیلتھ وزیٹر نے پر شکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بالآخر اس نے تمام دوائی میرے ہاتھ میں دے دی کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی اسے تمام گڑھوں میں پھینک کر ان لاروں کا خاتمہ کر دیا کروں گا۔ میں نے ان سب کو یقین دلایا، جس کے بعد وہ چلے گئے اور میں نے وہ لال دوائی واٹر ورکس کی بیس ہزار گیلن والی ٹنکی میں پھنکوادی۔

میں حسب دستور ہر یکے کی طرف سے آنے والی سڑک کے پاس پُل پر ٹانگیں لٹکائے اس گڑھے کے قریب بیٹھا تھا اور مچھر میرے سر پر سُریلی تانیں الاپتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا، وہ بے بضاعت پشے اپنی بھاشا میں کیا اور کون سا راگ الاپ رہے تھے۔ شاید وہ کہہ رہے تھے، اے اللہ کے نیک بندے! تو نے ہماری اولاد کی خبر گیری کی ہے، ہم تیری اولاد کی خبر گیری کریں گے، اور انہیں جلد ہی اس دنیا کے جیل خانے سے نجات حاصل کروادیں گے۔ یعنی ملیریا کے سب سے زیادہ تندرست جراثیم فخرو اور خالدہ کے جسم میں داخل کریں گے۔ میں نے جواباً کہا، اے میرے عزیز مچھرو۔۔۔ میں نے تمہاری اولاد کو بچا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ ایک معمولی انسانی فرض ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں چھاؤنی کے ہیڈ کوارٹرز ڈلہوزی جا چکے تھے اور انگریزی رجمنٹ کے بھی نصف سے زیادہ سپاہی ڈگشائی اور لوئر ٹوپا پہنچ گئے تھے۔ ان دنوں ننھے بھورے کا بیکار ٹٹّو سارا دن تھان پر بندھا رہتا اور ہر روز دوپہر ایک بجے کے قریب زور زور سے ہنہنایا کرتا۔ شاید وہ اس ایذا رساں نمدے والے جوئے کو یاد کرتا تھا جو کہ چند دنوں سے اس کے کندھے پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ننھے بھورے کا ٹٹّو، ان بیکاری کے دنوں میں یا تو کثرت سے پیشاب کیا کرتا، یا اپنی پچھاڑی سے لید کو چاروں طرف بکھیر دیتا۔ اس کے علاوہ اسے عزیزہ کی دونوں بکریوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان بکریوں کے نام گنگی اور جمنی تھے اور انہیں عزیزہ غازی آباد سے جہیز میں لائی تھی۔ جب گنگی اور جمنی اپنے گلے کے گھنگھروؤں کو بجاتی ہوئی، سبک رفتاری کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتیں تو وہ اپنی ٹانگوں کو ہوا میں اچھالنے لگتا اور رسّا تڑانے لگتا۔ وہ اپنے جسم کو گزند پہنچانے والی مکھّیوں کی بجائے، بے ضرر بکریوں کو اپنا دُشمن سمجھ لیتا۔ ٹانگیں ہوا میں اُچھالنے سے بکھری ہوئی لید میں بسنے والے تمام مچھر اُڑنے لگتے اور کیہرو خاکروب ان مچھروں کو بھگانے کے لیے فوراً املتاس اور شیشم کے سوکھے ہوئے

پتّوں میں آگ لگا کر گہرا دھواں پیدا کر دیتا۔ پیشاب اور لید کے تعفّن، مچھروں کی گھوں گھوں اور دھوئیں کی کثافت سے عزیزہ کا دل اور بھی ڈوبنے لگتا۔

جب بارش کے خدا نے میری عرض داشت مسترد کر دی اور گڑھا زیادہ سوکھ گیا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے پچاسی بنگلہ کے مالی سے گینتی مانگی اور ننھے بھورے کے ٹٹّو کی ناند سے لے کر اس گڑھے تک ایک نالی بنائی اور صاف اور تازہ پانی کو نالی میں انڈیل دیا۔۔۔ گڑھا پھر لبالب بھر گیا۔ میں پھر شام کو تاڑی لے کر گڑھے کے پاس جا بیٹھا اور کھانستے ہوئے ان کی تمام نقل و حرکت کا اندازہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ اور شفاف پانی نے ایک ہی دن میں لاروے کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ ڈھاب کے کناروں سے جدا نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں وہ پہلی سی چستی اور کھلنڈرا پن رہا ہے۔

ان دنوں آنریری مجسٹریٹ کشمیر جا رہا تھا اور اس کی چھوٹی بیوی، عزیزہ کو بطور رفیقہ کے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں حقیقت حال سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ عزیزہ کو بطور خادمہ کے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن میں اس بات کے لیے فوراً رضامند ہو گیا۔ محض اسی وجہ سے کہ وہ خواب، جن کی تکمیل میں ابھی تک

اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکا، اپنی عزیزہ کی زندگی میں پورے ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔ اس کے علاوہ خنک ہوا اور مصفّا پانی میسّر آنے سے عزیزہ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔ صرف راستے کی اونچ نیچ کی وجہ سے اس کا دل ڈوبنے کا احتمال تھا۔ لیکن مجسٹریٹ کی اپنی کار تھی۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ وہ لوگ اسے بڑے آرام سے کشمیر لے جائیں گے۔ میں نے ایک نامکمل سی خوشی میں گنگی اور جمنی دونوں کو بیچ دیا اور ان پیسوں سے عزیزہ کے لئے کچھ کپڑے لتے اور ایک کمبل خرید لیا اور ان لوگوں کے ساتھ اسے کشمیر روانہ کر دیا۔

مجھ جیسے لوگ، جو اپنے تخیّل کی مدد سے کثیف گڑھوں میں ہی خوبصورت جھیلیں دیکھ لیتے ہیں، قدرت بھی انہیں کثیف گڑھوں سے پرے جانے کی طاقت نہیں بخشتی۔۔۔ اس وقت جب کہ عزیزہ کشمیر کی ٹھنڈی ہوا کھا رہی ہو گی، میں اس گڑھے کے قریب بیٹھا ہوں گا۔ کام کے وقت کا بیشتر حصّہ اس گڑھے کے پاس ہی گزرتا تھا۔ لیکن صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھانجے مر چکے تھے۔ پچاسی بنگلے کے مالی نے مجھے بتایا کہ پانی کے باسی اور گندے ہو جانے سے اور کیڑے پیدا ہو جائیں گے اور دُم دار مینڈکوں میں بھی وہی پہلی سی چستی عود کر آئے گی۔ ننھے

بھورے کے ٹٹّو کا پیشاب بھی اسی نالے کے راستے سے گڑھے میں آنے لگا۔

اور ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے پھر مینڈکوں، لاروؤں کو پانی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے مخصوص، بے ڈھنگے انداز سے تیرتے ہوئے دیکھا۔ پانی کے باسی اور پیشاب وغیرہ کی وجہ سے گندہ ہو جانے سے گڑھے میں پھر ایک بار رونق پیدا ہو گئی اور میں ایک گونہ مطمئن، کھاٹ پر لیٹ کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

دھوپ اتنی تیز ہو چکی تھی اور چوماسا اس آفت کا تھا کہ پُل کے ارد گرد کا سارا رقبہ کھمبیوں سے بھر گیا۔ لیکن اس دن سے میں نے کبھی آسمان کی طرف بارش کے لیے نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کیڑے ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باسی نہ ہو گا، مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔

چوماسے کے دوسرے دن بڑی موسلا دھار بارش ہوئی۔ اس وقت میں تن تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا، اپنا پھٹا ہوا پاجامہ سی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لالہ کا دو ماہ کا بل کیسے ادا ہو گا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے فوراً اٹھ کر دروازہ

کھولا۔ میرے سامنے تار کا ہرکارہ تھا۔ عمر تیس پینتیس برس کے قریب ہو گی۔ چہرے کے سیاہ رنگ میں سے دو سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ اس کی خاکی وردی تمام بارش میں بھیک چکی تھی اور پانی کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے داڑھی کے بالوں سے قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ ایک انگلی سے چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے خاکی بلوز کے نیچے سے ایک بھیگا ہوا لفافہ نکالا اور بولا۔ ”میاں عزیز الدّین ٹھیکیدار کے مختار آپ ہیں؟“

میں نے بغیر جواب دیے اس بھیگے ہوئے لفافے کو ہاتھ میں لے کر کھولا۔ تار پریتم داس کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا۔ ”عزیزہ کو پہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا۔ اسے کل ہل ڈائریا و پیچش کی شکایت ہوئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے وہ مر گئی۔ چونکہ تمہارا ایک دن میں پہنچنا مشکل ہے، اس لیے میں ڈاکٹر کی سند لے کر اسے دفنا رہا ہوں۔ اپنی رضامندی بذریعہ تار بھیجو۔“

میرے دماغ نے اس حادثے کی اطلاع کو قبول نہ کیا۔ میں نے فقط دروازے تک پہنچتے ہوئے اتنا کہا۔ ”اے خدا! تو اپنی بارش کو تھام لے۔“

# گھر میں، بازار میں

دیوار پر لٹکتے ہوئے ''شیکوشا'' نے صبح کے آٹھ بجا دیے۔ درشی نے آنکھ کھولی اور ایک سوالیہ نگاہ سے نئے آبنوسی کلاک کی طرف دیکھا، جس کی آٹھ سُریلی ضربیں اس کے ذہن میں گونج پیدا کرتی ہوئی ہر لحظہ مدھم ہو رہی تھیں۔۔۔ ایک گھٹیا سا قالین تھا اور یہی ایک کلاک جو درشی کے استاد نے اسے شادی کے موقع پر بطور تحفہ دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی شاگرد ایک اچھی بیٹی ہونے کے علاوہ، ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو جائے۔۔۔ اور ہر روز صبح شیکوشا اپنے

مستقل، طنزیہ انداز میں مُسکراتا ہوا کہہ دیتا، ”میں سب کچھ جانتا ہوں، لیکن اب تو آٹھ بج گئے ہیں، سُست لڑکی“!

درشی کا پورا نام تھا پریہ درشنی۔ پریہ کا مطلب ہے پیاری اور درشنی کا مطلب ہے۔۔۔ دکھائی دینے والی، یعنی جو دیکھنے میں پیاری لگے، دل کو لبھائے، آنکھوں میں نشہ پیدا کرے۔۔۔ شاید اسی لیے درشی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا اور شیکوشا سے نظریں چُرانا ہوتیں۔۔۔ درشی بچپن ہی سے عصبی طور پر نحیف اور ضرورت سے زیادہ حساس تھی، اور اب شادی کے بعد محبّت کی بے اعتدالیوں سے وہ نسوں کی اور بھی کمزور ہو گئی۔

سسرال میں چند دن کے بعد جو سب سے بڑی دقّت درشی کو پیش آئی، وہ اپنے خاوند رتن لال سے پیسے مانگنا تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے باپ سے بلا تامل پیسے مانگ لیا کرتی تھی اور اگر کبھی وہ اپنے مربعوں کے کام میں چوک بھی جاتے، تو درشی، ان کی لاڈلی بیٹی، ان کے کوٹ کی جیب میں سے ضرورت کے مطابق نکال لیا کرتی، ”پاپا“ کا کوٹ ہمیشہ زنانے میں کسی پیٹی کوٹ کے اوپر ٹنگا ہوا مل جاتا تھا۔ اپنے میکے سے جتنے پیسے وہ ساتھ لائی تھی، وہ سب شگن کے پیسوں سمیت ایک

خوبصورت، طلائی گھڑی پر ختم ہو چکے تھے۔ خرچ کی یہ مد وہ رتن سے چھپانا نہیں چاہتی تھی، البتہ رتن سے ضرورت کے مطابق پیسے مانگتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جب ان کی روحوں کا ملاپ ہو گا، تب وہ پیسے مانگ لے گی۔ اس صورت میں وہ پیسے مانگ کر بکنا نہیں چاہتی۔

کئی دفعہ بازار میں کسی چیز کی خرید ہوتی تو درشی اپنی پتلی پتلی، نازک، کانپتی ہوئی انگلیاں اپنے صابر کے خوبصورت لیکن خالی بٹوے میں ڈال دیتی اور کہتی، ”چھوڑیے، رہنے دیجیے۔۔۔پیسے میں دوں گی۔“

رتن لال اسی وقت درشی کا ہاتھ تھام لیتا اور سیلز مین سے نظریں چراتا ہوا، محبت کے انداز سے درشی کی طرف دیکھتا اور کہتا۔ ”ایک ہی بات تو ہے، درشی۔“

اس وقت درشی محبّت کی ایک پُر لطف ٹیس محسوس کرتے ہوئے چُپ ہو جاتی۔ اسے یقین تھا کہ رتن کبھی بھی اسے پیسے ادا کرنے نہیں دے گا۔ کیا وہ اس کی بیوی نہیں ہے؟ آخر کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ خود ہی اس کے تمام چھوٹے موٹے خرچوں کا کفیل ہو؟

ان دنوں برسات شروع تھی اور رتن کا برساتی کوٹ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ بارش کے قطرے اس میں کسی نہ کسی طرح گھس ہی آتے تھے۔ اسے خریدنے کے لیے درشی اور رتن بازار گئے۔ سوسٹیکا سٹورز میں انہیں ایک اچھا سا کوٹ مل گیا۔ قیمت طے ہونے سے پہلے ہی درشی نے حسب دستور بیگ کے بٹن کھول دیے اور بولی۔ "پیسے میں دیتی ہوں، رہنے دیجیے۔" رتن لال نے اپنے ہاتھوں میں دس کا نوٹ مسلتے ہوئے کہا۔ "اچھا، تو تمہارے پاس ریز گاری ہو گی؟" درشی گھبرا گئی۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے یونہی کچھ دیر کے لیے بیگ کو ٹٹولا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ "اوہ! بھول گئی میں۔۔۔ ریز گاری تو میرے پاس بھی نہیں۔" رتن لال نے اسی اثنا میں انگلی کے گرد نوٹ کے بہت سے چکر دے ڈالے اور عصبی طور پر کمزور درشی خاموش رہنے کی بجائے کہنے لگی "ریز گاری تو گھر ہی رہ گئی۔۔۔ میرے پاس تو پانچ پانچ کے نوٹ ہوں گے۔"

درشی نے غالباً یہی سمجھا کہ رتن لال پھر ایک دفعہ میٹھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھ لے گا اور پھر پیسوں کی ادائیگی کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔ لیکن وہ یہ بھول ہی گئی کہ شادی کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اب تکلّف کی چنداں

بات نہیں رہی۔ رتن نے کوٹ کو اتارتے ہوئے کہا،

"تو اچھا، پانچ پانچ کے دو نوٹ ہی دے دو، یہ لو، رکھ لو دس کا نوٹ۔"

اس وقت درشی کے کان گرم ہو گئے۔ جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے بلا وجہ برساتی کو اِدھر اُدھر اُلٹانا شروع کیا۔ برساتی کے ایک کنارے پر سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں اسے نجات کی راہ دکھائی دی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے نہایت خشمگیں انداز سے کہا۔

"یہ تو پھٹی ہوئی ہے۔۔۔ کوڑی کام کی نہیں یہ۔"

اور پھر دکاندار کو مخاطب ہوئے اسی لہجے میں بولی۔ "بھلا آپ نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے جی، جو پھٹا ہوا کوٹ ہمیں مڑھ رہے ہیں؟"

سیلز مین بالکل گھبرا گیا اور فوراً نئے کوٹ لینے کے لیے دکان کے اوپر چلا گیا۔ درشی کی برہمی کی وجہ سے رتن بھی سہم گیا اور ایک مصنوعی غصّے سے دکاندار کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت درشی نے رتن کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آئی۔ سامنے سیڑھی پر سیلز مین برساتیوں کے بوجھ سے لدا ہوا اسٹاک روم سے نیچے اُتر

رہا تھا، لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ حسین جوڑا نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔

رتن نے دیکھا درشی کے منہ پر سیاہی بکھر گئی تھی اور ماتھے پر ایک بڑے سے قرمزی دھبے میں سے پسینہ کے قطرے بے تحاشا امڈ رہے تھے۔ بازار سے لے کر گھر تک اس کی بیوی لکنت بھری باتیں کرتی رہی۔ اور رتن اس کی ایک بات کا بھی مطلب نہ سمجھا، اور جب اس نے تانگے پر سے ہاتھ دے کر درشی کو اتارا تو اسے معلوم ہوا کہ درشی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور چونکہ وہ عورت کے سیدھے سادے تسلسل کی ایک کڑی کھو بیٹھا، اس نے مرد کی دیرینہ عادت کے مطابق کہنا شروع کیا۔ عورت ایک معمّا ہے۔ شوپنہار کہتا تھا۔

اگلے دن درشی سو کر اُٹھی تو آٹھ کی بجائے آٹھ پینتیس ہو چکے تھے اور سورج ان کے دریچہ پر آ گیا تھا۔ اس کی شعاعیں کلاک کے شیشے میں سے منعکس ہوتی ہوئی درشی کے چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔ کلاک کے بڑے بڑے رومن ہندسوں میں خالی سفید جگہ، بڑے بڑے دانت بن گئی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شیکوشا طنز کی حد سے گزر چکا ہے اور کھکھلا کر ہنس رہا ہے۔ اور شیکوشا اکیلا ہی نہ تھا۔ اس کے

ساتھ ککو کی ماں بھی تو شریک ہو گئی تھی۔ ککو کی ماں رتن کے ہاں ملازمہ تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ صبح جب وہ چائے لے کر آئی تو رانی جی کو یوں تھکے تھکے دیکھ کر ''خی غی۔۔۔ غی خی'' کے انداز سے ہنسنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو ہم بھی بہت دن گئے جاگا کرتے تھے۔ ہماری آنکھوں میں بھی خمار ہوتا تھا اور اب راتوں کو جگانے والے بھگوان کے دوارے ہی چلے گئے، آہ! مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ میرے لہنگے کے لیے بہت سُندر گوٹا اور کنگری لائے تھے۔ اس دن تو وہ پہلے اندر ہی نہیں آئے۔ دروازے پر ہی کھڑے مُسکراتے رہے اور جب اندر آئے تو ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا اور وہ گوٹا دیکھ کر میری سب تکان اتر گئی تھی۔

درشی نے چلاتے ہوئے کہا، ''ککو کی ماں''!

ککو کی ماں کے لبوں پر تبسّم نہیں رہا۔ صرف اس کا سایہ رہ گیا۔ ہلکی سی سُرخی سے اس کا رنگ سپیدی اور سپیدی سے زردی اور سیاہی مائل ہو گیا اور وہ حیرت سے کلاک کی ٹِک ٹِک کو سننے لگی۔ درشی کے لیے وہ معمولی ٹِک ٹِک ہتھوڑے کی ضربوں سے کم نہ تھی۔ استاد کی عزّت ملحوظِ خاطر نہ ہوتی تو وہ پتھّر مار کر اس کی ٹِک

ٹِک کو روک دیتی۔ ککو کی ماں سوچ رہی تھی۔ آخر مالکن کیوں خفا ہو رہی ہے۔ حالاں کہ رتن بابو نے اسے ایک نئی ساڑی خرید کر لا دی ہے، جس پر پورا ایک ہاتھ چوڑا طلائی باڈر لگا ہے اور اس کے اندازے کے مطابق اس کی تمام تھکاوٹ دور کر دینے کے لیے کافی ہے۔

درشی نے کہا۔ ''آج پھر تو نے چمچہ بھر چائے کے پانی میں دودھ کی گاگر انڈیل دی۔"

ککو کی ماں نے سہمے ہوئے کہا۔ ''رتن بابو نے کہا تھا، رانی۔"

''کیا کہا تھا انہوں نے؟"

''کہا تھا۔۔۔ رانی بیمار ہے۔"

ککو کی ماں نے ٹرے اٹھائی اور آنکھوں سے ایک ہاتھ چوڑے طلائی باڈر کو دیکھتی اور دل میں بھگوان کو کوستی ہوئی چلی گئی۔ درشی سوچنے لگی، کیا رتن کو اس کی کمزوری کا پتہ چل گیا ہے؟ اسی لیے تو وہ اس قسم کی چائے کو میرے لیے غیر مفید سمجھنے لگا ہے، اور کیا معلوم جو اس نے سوتے میں میرے بیگ کی تلاشی بھی لی ہو۔

اس نے زناٹے سے ایک ہاتھ سرہانے کے نیچے مارا۔ بیگ موجود تھا، اور تھا بھی جوں کا توں بند۔

بیگ کے ایک کونے میں جھومروں کی ایک جوڑی پڑی تھی۔ درشی جھومروں کی بہت شوقین تھی۔ لیکن اس کے بیاہ میں جتنے بھی زیور دیے گئے تھے، وہ سب کے سب وزنی تھے اور دیہاتی طرز کے بنے ہوئے۔ اکیلے جھومر ہی ڈیڑھ تولہ کے تھے۔ درشی جانتی تھی کہ رتن ان لمبے جھومروں کو پہنے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ خود بھی رتن کو خوش رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ وزنی جھومر پہننے سے اسے اپنے کان ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ انہیں نصف گھنٹہ سے زیادہ دیر تک نہیں پہن سکتی تھی۔

پر یہ درشی کی خواہش تھی کہ وہ ہلکے سے جھومر خرید لیتی۔ یہی کوئی سستی سی جوڑی۔ لیکن ان کے لیے وہ رتن سے پیسے نہ مانگے گی، تاوقتیکہ وہ خود اپنے فرض کو محسوس کرتا ہوا پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دیدے۔

معاً اس کا خیال پاپا کی طرف چلا گیا۔ ان سے تو وہ پیسے لڑ کر بھی مانگ لیتی تھی۔ کسی خیال کے آنے سے درشی اٹھی اور اپنے ہی کمرے میں جب اس نے الماری

کھولی تو اس کی جارجٹ کی ساڑی کے اوپر، رتن کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ درشی کے منہ پر ایک سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا تمام مرد ایک ہی سے لاپروا ہوتے ہیں۔ یہی مردوں کا جوہر ہے اور پھر زنانے میں پیٹی کوٹ یا جارجٹ کی ساڑی کے اوپر اپنا کوٹ شاید عمداً بھول جانے کا کیا یہ مطلب نہیں کہ اس کوٹ کے ساتھ جیسا سلوک مناسب سمجھا جائے، کیا جائے۔ گویا کوٹ زبان حال سے کہہ رہا ہو ”میں نے تجھے مسل ڈالا ہے، تو اس کے عوض میں میری جیبیں کاٹ ڈال۔“ درشی نے دروازے پر نظر گاڑے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چار نوٹ اور کچھ ریز گاری آ گئی۔ اس نے سوچا اگر وہ اس میں سے ضرورت کے مطابق کچھ اُڑا لے تو رتن کیا کہے گا۔ لیکن۔۔۔ چوری تو ایک ذلیل حرکت ہے۔ ابھی تو روحوں کا ملاپ نہیں ہوا۔ وہ یوں جیب میں سے پیسے اڑا کر بیسوا، نہ کہلائے گی؟

دو تین دن تک درشی کو ہری پال پور، اپنے مربعوں سے بذریعہ تار سو روپے آ چکے تھے۔ شگن کے اور روپے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بہت حد تک درشی کی عصبی کمزوری کو آرام پہنچایا۔ ککو کی ماں بھی خوش تھی اور بھگوان کو کم یاد کرتی

تھی۔ درشی نے کئی مرتبہ رتن کو کہا کہ بازار جاکر برساتی کوٹ خرید لینا چاہیے۔ برسات کے بعد اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ لیکن چند دنوں سے رتن لال اپنے دفتر میں اسمبلی کے لیے ہندسے تیار کر رہا تھا اور اس کے لیے اسے بارش، دھوپ، ساڑی کسی چیز کی پروانہ تھی اور اس بات نے درشی کو بہت غمگین کر دیا تھا۔

ایک شام رتن گھر واپس آیا تو درشی کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں جھومروں کی ایک جوڑی تھی۔ جو تھی بھی بہت ہلکی اور جدید فیشن کی۔ درشی خوش نہیں ہوئی، کیونکہ وہ جھومر اس نے خود نہیں خریدے تھے، رتن نے انہیں اپنی خاطر خریدا تھا۔ وہ خود بھی تو اسے جھومر پہنے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کی فرمائش پر زیور خریدنا پسند نہیں کرتے، بلکہ ان کو اپنے لیے سجانے کو خریدتے ہیں۔ درشی کو تسکین ہوئی بھی تو محض اسی لیے کہ رتن انہیں خود بخود خرید لایا اور ایسا کرنے میں اس نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

جھومروں کی جوڑی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ طنزیہ انداز سے بولی، ”ختم ہو گئے آپ کے ہندسے ؟“

"ختم ہو گئے۔"

رتن نے درشی کا ہاتھ پکڑا تو اس نے جھٹکے سے چھڑا لیا۔ بولی "اب میرے ہندسے شروع ہیں۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ کم سے کم تین بھتیجوں کے سوئٹر بننے ہیں۔"

رتن نے پھر ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تو کیا تمہیں جھومر پسند نہیں؟"

"جھومر؟۔۔۔ اوہ! ہاں۔" درشی منہ پھلاتے ہوئے بولی۔ "آپ نے بہت تکلیف کی۔"

شیکو شا بدستور مُسکرا رہا تھا۔ وہ محض ایک کلاک ہی نہیں تھا، چوبیس گھنٹے متواتر ٹِک ٹِک کرنے والا۔ وہ درشی کا اُستاد بھی تھا، جس کے ڈائل اور سوئیوں نے درشی کو ایک اچھی لڑکی کے طور پر دیکھا تھا اور اب شاید ایک اچھی بیوی کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

رتن پہلی کڑی کھو دینے سے منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ درشی کی باتوں میں طنز نہ پا سکا، تو وہ بولی۔

"آپ تو یونہی میرے لیے پیسے برباد کرتے ہیں۔۔۔ بھلا اور بھی کوئی ایسے کرتا ہے؟"

رتن پھٹی پھٹی آنکھوں سے درشی کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر درشی اسی وقت وہ جھومر اپنے کانوں میں نہ ڈال لیتی تو دنیا کی تاریخ کسی اور ہی ڈھب سے لکھی جاتی۔ اس نے نہ صرف جھومر پہنے، بلکہ اپنی گردن کو عجب انداز سے اِدھر اُدھر ہلا دیا اور رتن ایک ایماندار آدمی کی طرح اس کی گردن اور اس کے ہلتے ہوئے جھومروں کے متعلق سوچنے لگا۔

یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ابھی تک درشی کی تسلّی نہیں ہوئی۔ وہ بولی۔

"کیا لاگت آئی ہے اس پہ؟"

"کوئی بہت نہیں۔"

"تو بھی۔"

"ساڑھے اکتیس روپے۔"

درشی نے اپنے صابر کے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ رتن ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک

گیا۔ وہ شاید اس بات کو مذاق سمجھ کر جانے دیتا۔ لیکن درشی کے چہرے نے اسے مذاق کی حدود سے بلند و بالا اٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد رتن نے اندھیرے میں اپنے پاؤں تلے زمین محسوس کی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی کڑی اس کے ہاتھ آگئی ہو۔ اس نے اپنی جیب میں سے تمام نقدی نکالی اور اندھیرے میں درشی کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اس دن اپنی کسی ضرورت کا ذکر کر رہی تھیں۔ لو، یہ اپنی مرضی سے خرچ کر لینا۔“

درشی نے ایک ثانیہ کے لیے سوچا۔ رتن نے ایسا کرنے میں عورت کو سب سے بری گالی دی ہے۔۔۔ ”بیسوا“!

بیاہ کو ایک دو سال گزر گئے، لیکن دونوں کی روحوں میں کوئی خاص بالیدگی نہیں آئی۔ بلکہ رتن اب کچھ کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ اس عرصہ میں درشی بیوی کے تمام ہنر سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ حساس ویسے ہی تھی۔ آج تک اس نے کھلے بندوں رتن سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ وہ بسا اوقات اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو کوسا کرتی۔ عموماً یوں ہوتا کہ بچّے کے فراک یا اسے کیلشیم دینے کا ذکر ہوتا تو وافر پیسے مل جاتے اور پھر رتن اس کی ضرورت اور اپنے شوق سے متاثر ہو کر خود بھی اسے

کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا۔ ہری پال پور میں بھی آنا جانا بنا ہی ہوا تھا۔ اگرچہ درشی کی ماں سوتیلی تھی، باپ تو سوتیلا نہیں تھا۔ بڑا بھائی ایگزیکٹو انجنیئر ہو چکا تھا اور پھر دفتر اور ہندسوں کے بعد رتن کا کوٹ اس کے پیٹی کوٹ پر ٹنگا ہوتا۔

اس ایک دو برس کے عرصہ میں شیکوشا کا چہرہ قدرے پیلا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ پہلی سی شرارت اور طنز آمیز مسکراہٹ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا تو اس کی مرمّت کر دی جاتی۔

ایک دن رتن لال شب کو کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا۔ صبح واپس آیا تو درشی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آج صبح میں نے ایک واقعہ دیکھا۔"

درشی نے بچّے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ "کیا دیکھا ہے آپ نے؟"

رتن بولا۔ "میں کہتا ہوں۔۔۔ یہ بازاری عورتیں کتنی بے حیا ہوتی ہیں۔ آج میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا، جس کے بال الجھے ہوئے تھے، جس کی آنکھیں خمار آلودہ تھیں، جسم سے بیمار دکھائی دیتی تھی۔ صبح صبح سرِ بازار اس نے ایک بابُو

کو کالر سے پکڑا ہوا تھا اور پیسے مانگ رہی تھی۔ وہ بابو بیچارہ کوئی بہت ہی شریف آدمی تھا۔ وہ چیختا تھا، چلّاتا تھا۔ کہتا تھا میں نے اسے ایک خوبصورت ساڑی لا کر دی ہے۔ گر گابی خرید دی ہے اور اب پیسے طلب کرتی ہے۔

وہ بے غیرت بھرے بازار میں کہہ رہی تھی کہ وہ تو سب حسن کی نیاز ہے۔ اس نے اپنے لیے مجھے وہ ساڑی پہنوائی تھی۔ اپنے لیے گر گابی، جسے پہن کر میں اس کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو گئی۔ لیکن مجھے پیسے چاہئیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، مجھے اپنے بچّے کے لیے کپڑے چاہئیں، میں نے کرایہ دینا ہے، مجھے پوڈر کی ضرورت ہے۔"

اور اس کے بعد رتن ہنسنے لگا۔ بے معنی، بے مطلب ہنسی اور اس عرصہ میں اپنا سلوٹوں سے بھرا ہوا کالر چھپاتا رہا۔ اس بات کو سن کر درشی کی ساری طبعی کمزوری واپس آ گئی۔ درشی نے محسوس کیا، اس میں جتنی کمزوریاں تھیں وہ بیسوا میں مفقود تھیں۔ وہ اس کے جسم کا بقیہ حصّہ تھی جسے اپنے آپ میں محسوس کرتے ہوئے وہ ایک مکمل عورت ہو گئی تھی۔ درشی نے سر سے پاؤں تک شعلہ بنتے ہوئے کہا۔ "وہ بابو، پاجی آدمی ہے۔ کمینہ ہے۔ اور وہ بیسوا کسی گھر ستن سے

کیا بری ہے؟"

رتن لال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے درشی کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا مطلب ہے۔۔۔اِس جگہ اور اُس جگہ میں کوئی فرق نہیں؟"

درشی نے اسی طرح بپھرے ہوئے کہا۔ "فرق کیوں نہیں۔۔۔ یہاں بازار کی نسبت شور کم ہوتا ہے۔"

کلاک کی ٹِک ٹِک بند ہو گئی۔ رتن لال سوچنے لگا۔ "عورت سچ مچ ایک معما ہے اور شوپنہار نے۔۔۔"!

# دوسرا کنارہ

کھاڑی کے اس کنارے، ڈھوک عبد الاحد کے ایک سنگلاخ ٹیلے پر کھڑے ہونے سے، دوسرا کنارہ بہت دور، ایک دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ دوسرے کنارے پر اور اس سے پرے کیا ہے، اس کے متعلق ہم تینوں بھائیوں میں سے ایک بھی نہ جانتا تھا۔ اس پار، حدِّ نگاہ سے پرے، ایک نقرئی سی لکیر سورج کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی نظر آتی تھی، جو کہ فوراً ہی دھند کی لطیف چلمن کے پیچھے غائب ہو جاتی۔ وہ لکیر غالباً پانی کی ایک ندی تھی جو کہ ڈھوک عبد الاحد کے شمال میں

کھاڑی سے علاحدہ ہو کر دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھی۔

دوسرا کنارہ ہمیشہ پُراسرار ہوتا ہے اور انسان کا مطمح نظر۔ انسان ہمیشہ پہنچ سے باہر چیز کا مشتاق ہے۔ اس کی زندگی کے بہت سے رومان کا فلسفہ بھی یہی ہے۔۔۔ زندگی کے دوسرے کنارے پر کیا ہے؟ یہ زید جانتا ہے نہ بکر، راستہ میں موت حائل ہے، اور ڈھوک عبد الاحد کے قصبے میں کھڑے ہو کر دکھائی دینے والے دوسرے کنارے پر کیا تھا؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ راستہ میں موت کی سی ذخار کھاڑی حائل تھی۔

حق تو یہ ہے کہ اسی کھاڑی نے ہماری محنت کش، نزع کی سی زندگی میں رومان پیدا کر دیا تھا اور ہمارے تصوّر میں ایک ہلکی سی رنگ آمیزی ہو گئی تھی۔ اس خوبصورت نیلاہٹ کی مانند، جو سفید براق کفن کی تہوں میں دکھائی دیتی ہے۔ بسا اوقات جب میں بیکری کے دوزخ نما چولھے میں سے آخری ڈبل روٹی نکالتا تو فورا ڈھوک کے سنگلاخ ٹیلے پر جا کھڑا ہوتا، اور مستفسرانہ نگاہوں سے فیری بوٹ میں سے اُترنے والے مسافروں کے رنگ روپ، چال ڈھال، وضع قطع کا معائنہ کرتا۔

کبھی کبھی قصبے کے بینکر کے بڑے مرغی خانہ کے لیے دوسرے کنارے کی طرف سے بڑے بڑے لیگ ہارن نژاد مرغ، دیسی مرغیوں سے جفت کرنے کے لیے منگوائے جاتے اور یہاں سے بڑے بڑے وزنی انڈے اس پار لے جانے کے لیے ٹوکریوں میں بند کیے جاتے۔ ہماری بیکری کی روٹیاں بھی اسی فیری بوٹ میں لے جائی جاتی تھیں۔ ہمارے باپ نے فیری کے مالک سے سال بھر کا ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ وہ خود کئی دفعہ دوسرے کنارے پر گئے تھے اور اکثر اس پار کے بہت دلچسپ قصّے ہمیں سنایا کرتے تھے۔

ایک دن میں چولھے کے پاس بیٹھا، پسینہ میں شرابور، خمیرے آٹے کی ٹکیاں بنا رہا تھا، تو سندر، میرا بڑا بھائی آیا۔ وہ غمگین سا دکھائی دیتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے قریب پڑا ہوا پانی کا ایک گلاس اٹھایا اور پی گیا۔ پھر سنگتروں کے سوکھے ہوئے چھلکے اٹھائے اور کسی گہری سوچ میں مستغرق، ان چھلکوں کو خمیری ٹکیوں پر چپکانے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”تحصیلدار آیا ہے، نیا تحصیلدار۔۔۔“

میں زیادہ تیزی سے ٹکیاں بنانے لگا۔ خمیرے آٹے کے ایک ٹکڑے کو میں نے

ہوا میں اچھالا۔ وہ گول گول چکر کاٹتا ہوا میرے ہاتھوں میں گرا۔ یہ میں اس لیے کیا کرتا تھا کہ میرے دوزخی کام میں کچھ دلچسپی پیدا ہو جائے۔ لیکن کیا اس سے بیکری کے چولھے کی تمازت کم ہو جاتی تھی اور آگ میرے لیے اپنی فطرت کو خیر باد کہہ دیتی تھی؟

جب میں نے سندر کی بات کو نہ سنا، تو اس نے چوکی کو میرے قریب سرکایا اور میرے کندھے کو چھوتے ہوئے بولا۔

"تم نے سنا؟ تحصیلدار آیا ہے۔"

میں نے جھلا کر سندر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تو پھر بہت سی روٹیاں درکار ہوں گی۔۔۔ ہے نا؟"

سندر نے اپنے بازو اوپر اٹھائے، قمیص کو اُتار کر بہت دور کھاٹ پر پھینک دیا اور دو تین خمیری روٹیوں پر سنگترے کا چھلکا چپکاتے ہوئے بولا۔

"رجو۔۔۔ تم نہیں جانتے علمو کو، وہ میرا لنگوٹیا یار تھا۔ اب اسے علمو نہ کہنا۔ وہ اب خاں صاحب علم الدّین ہو چکا ہے۔ اور ڈھوک ہی میں تحصیلدار ہو کر آیا

ہے۔ چھ سال ہوئے وہ کھاڑی کے اس طرف گیا تھا۔۔۔"

میں نے اسی وقت خمیرے آٹے کو ملنا چھوڑ دیا اور حیرت سے سندر کی باتوں کو سننے لگا۔۔۔ بہت سی باتیں سنانے کے بعد سندر اپنے ہاتھوں سے انڈوں کے چھلکے اکٹھے کرنے لگا۔ سندر کی باتوں میں کچھ خلش تھی اور اضطراب۔۔۔ علمو، اب خاں صاحب علم الدّین ہو چکا ہے اور سندر ابھی وہیں بھاڑ جھونک رہا ہے۔ اس بات میں بیکری کی آگ سے زیادہ جلن تھی، سندر کے لیے۔

دو تین دن تک سندر بہت خاموش رہا۔ جب وہ بھاڑ کے قریب جھک کر بڑے خوانچے سے چولھے میں پڑی خمیری روٹی کو نکالتا تو کچھ سوچ میں غرق ہو جاتا۔ ایک دن بہت سی ٹکیاں جل گئیں، اس دن ہمارا باپ بہت غصّے ہوا اور اس نے ایک پتلی سی بید کی چھڑی سے سندر کو پیٹ ڈالا۔ وہ بید کی چھڑی اسی مطلب کے لیے پانی میں بھگوئی جاتی تھی تا کہ زیادہ سے زیادہ عبرت ناک سزا دی جا سکے۔ باپو کے برابر کا ہونے کے باوجود سندر عموماً اس مار کو خاموشی سے سہ لیا کرتا تھا۔ باپو سندر کو مارتا تھا اور کہتا تھا۔ "بڑا تحصیلدار بنا پھرتا ہے۔۔۔ حرام کار۔"

اس وقت ہم دونوں، تینوں بھائیوں کی نگاہیں اس پار چلی جاتیں، جہاں سے

تحصیلدار بن کر آتے تھے، جہاں دن میں مشکل سے دس درجن روٹیاں بنانے والا بیکری کا مالک ہمیں بھیجنے کے اہل نہیں تھا۔ لیکن جب ہم تحصیلدار نہ بنتے تو ہمیں پیٹا کرتا اور اپنے بال بھی نوچ لیتا۔ ہمارے زخموں کو سینکتا اور پھر مار کر زخمی کر دیتا۔

ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ اس پار بڑی دولت ہے۔ جو کوئی بھی جاتا ہے، مالا مال ہو کر آتا ہے۔ وہاں بڑے شہر میں ایک 'جونا بسٹی' ہے جہاں تحصیلدار بنانے کی ایک کل رکھی ہے۔ کلکٹر بھی شاید اسی میں سے نکالے جاتے ہیں۔ ڈھوک عبد الاحد کا داروغہ صفائی، جو ہر روز ہماری روٹیوں میں نقص بینی کرتا ہے، اسے ہی چھو کر آیا ہے۔ جب ہم نے ٹیلے پر سے کھاڑی کی طرف دیکھا تو ہمیں پاؤں کے نیچے فیری آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ اس میں سفید سفید انڈوں کے ٹوکرے ٹیلے پر سے موتیوں کی ڈبیوں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ آنکھ پر ہاتھ رکھنے سے دور ایک نقرئی سی لکیر نظر آتی تھی جو کہ سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی فوراً ہی ایک دھند کے پیچھے غائب ہو جاتی تھی۔

ہر سال پوہ ماگھ کے مہینوں میں ہمیں دو تین سَو کے قریب روٹیاں روزانہ نکالنی پڑتی تھیں۔ بہت سے سنگتروں کے چھلکے، سکھانے ہوتے۔ پانچ سات بوریاں میدے اور آٹے کی اُٹھوانی ہوتیں۔ پیسے سیجن کے بعد چکا دیے جاتے تھے۔ ان مہینوں کو باپو سیجن کے مہینے کہا کرتا تھا۔ جس طرح اسقاط اور اٹھرا کی مریضہ مخصوص مہینے کو خوف سے ''ان گنا'' کہتی ہے، اسی طرح ہم ''سیجن'' کو ان گنا کہا کرتے تھے۔۔۔ سنتے ہیں کھاڑی کے اس پار ایک بڑے سے گھنٹہ گھر کے اردگرد سینکڑوں ہزاروں صاحب لوگ رہتے تھے۔ ان دنوں ان کا میلہ ہوتا تھا، جسے وہ لوگ کرسمس کہتے تھے۔ جس میں مرد عورت ننگے ہو کر ناچتے تھے، تب بڑا مزہ ہوتا تھا اور۔۔۔ ہمیں سینکڑوں روٹیاں نکالنی پڑتی تھیں۔

یہ 'سیجن' کی بات ہے۔ باپو نے ایک دن ہمیں اس شرط پر چھٹی دے دی کہ فیری کے دوسرے پھیرے پر دن کی تمام روٹیاں وہاں پہنچا دی جاویں۔ ہم نے جلدی جلدی روٹیوں کو بھاڑ میں سے نکالا اور ٹوکریوں میں ڈال کر فیری کی طرف چلے گئے۔

اس دن آسمان پر ایک مٹیالی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں آندھی کی توقع تھی۔

پوہ ماگھ کے مہینے میں ڈھوک عبد الاحد میں آندھیاں آ جاتی ہیں۔ ذرا سی تیز ہوا یا بگولا چلنے سے کھاڑی کے شمال کی طرف پڑی ہوئی سینکڑوں من ریت آسمان پر چڑھ جاتی ہے۔ اس دن تند ہوا پانی میں لہروں کے جذبات پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک اچھال سی آتی اور پانی ہمارے گھٹنوں میں لوٹتا ہوا بہت سے گھونگے اور سبز سا جالا چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ کبھی کبھار اچھال کے ساتھ کوئی مچھلی کنارے پر رہ جاتی اور پانی کے لیے مُضطرب، خشک، ریتلی زمین پر تڑپنے لگتی۔ لوگ دوڑ کر اسے پکڑ لیتے اور وہیں بھون کر کھا جاتے۔

فیری دھیمے دھیمے ہچکولے کھاتے ہوئے کنارے پر آ لگی۔ اس میں تحصیلدار جوق در جوق اترنے لگے۔ ان لوگوں میں کچھ جان پہچان کے تھے اور کچھ ناواقف۔ دو ایک پٹی نور بیگ کے مَلک تھے، جو بندوق کا لائسنس لینے کے لیے اس پار گئے تھے۔ اس کے بعد ایک بڑا سا ڈربہ اترا۔ جس میں سے کلک کلک، کوکو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً بینکر کے وسیع مرغی خانے کے لیے مزید لیگ ہارن منگوائے گئے تھے۔

اس وقت باپو بھی آ گیا۔ فیری کے مالک سے سال بھر کے کرایے کا فیصلہ کرنا تھا۔

ہم سب کی نظریں فیری کے کونے میں بیٹھی ہوئی میم صاحب پر جم گئیں۔ اس کا حسن سب کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ میم صاحب کے سر پر ایک ہلکی سی کالے سلک کی ٹوپی تھی، جسے اُڑ جانے کے خوف سے اس نے مرمریں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ کمر میں پڑی ہوئی پیٹی اور اٹھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے چھاتی کا ابھار ایک چٹان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ معاً میرا خیال اپنی بھاوج کی طرف چلا گیا جس کی چھاتیاں کسی مروڑے ہوئے مرغ کی گردن کی طرح لٹک رہی تھیں۔ سندر کا بیاہ ہوئے ابھی بمشکل پانچ سال ہوئے ہوں گے کہ تین بچوں کی پیدائش نے بھابی کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

اور میم صاحب نے ایک ریشمی چھینٹ کا گون پہن رکھا تھا جو کہ اس کے جسم کے تمام عناصر کی وضاحت کر رہا تھا۔ ننگے بازو ڈبل روٹی سے بھی زیادہ نرم تھے اور خوبصورت، سڈول پنڈلیاں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، یا شاید وہ دو شگفتہ ٹہنیاں تھیں جن کے سرے پر پاؤں کے دو گلابی کنول کھلے ہوئے تھے۔

معاً فیری کے مالک نے کہا۔

”خان کی بیوی ہے، ولایت سے۔۔۔“

"کون خان؟" باپو متحیر ہو کر پوچھا۔

"تحصیلدار صاحب۔"

سندر نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "ارے علمو کی۔۔۔؟"

باپو نے غصّے سے سندر کی طرف دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولا "چپ رہو۔۔۔ حرامکار۔"

میں نے دل میں سوچا۔ ولایت سے آئی ہے، لیکن ولایت سے تو لیگ ہارن نژاد مرغ آتے ہیں، مگر لیگ ہارن مرغیاں آجائیں تو کون منع کرتا ہے۔ پھر آج کل میلے کے دن ہیں۔ خان صاحب کو لینے آئی ہو گی اور کرسمس کے میلہ میں یہ لوگ گھنٹہ گھر کے ارد گرد ننگے ناچیں گے۔ یہاں، کم بخت ڈھوک میں ان کو کون ناچنے دے گا۔ ان پریوں اور تحصیلدار کے لیے وہی جگہ مناسب ہے، اس پار، دوسرے کنارے پر۔۔۔

اس دن شام کو ہم اداس خاطر ہو کر واپس لوٹے۔ گھر آتے ہی سندر نے اپنی پرانی پگڑی کو پھاڑا، چلم کو صاف کیا، نیا تہمد باندھا اور ڈھوک کے چوپال کی طرف چلا

گیا۔ وہاں چوپال میں بہت سے لوگ آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ صبح کو باوا کا نوکر پیپل اور بڑ کی گولروں کو صاف کر جاتا اور ایک خستہ سی دیوار کے نیچے بڑی سی کھوہ میں بہت سے اُپلے سلگا کر چلا جاتا۔ اسے اس کام کا ثواب خاص خدا کی درگاہ سے ملتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر سندر نے تحصیلدار کو جی بھر کے کوسا اور خان صاحب کی بیوی کی بے حیائی کا تذکرہ کیا۔

اس دن ماں نے بھابی لکھمی کو ہدایت دی کہ خمیرے آٹے میں ڈالے جانے والے انڈوں کو گندے انڈوں سے علاحدہ کر دے۔ اس دن بھابی لکھمی کو فرصت نہ ملی۔ ننھے پنجو کے گلے میں ایک بڑا سا پھوڑا نکل آیا تھا جسے دکھانے کے لیے وہ ڈھوک کے سب سے بڑے جرّاح کے پاس چلی گئی اور جرّاح کے بے وقت چیر ڈالنے سے وہ پھوڑا نہایت خوفناک شکل اختیار کر گیا۔ لکھمی پنجو کو گودی میں ڈالے سارا دن روتی رہی۔

اگلی صبح جب ہم تینوں بھائی کام کر رہے تھے، تو باپو حسب دستور گالیاں دیتا ہوا چلا آیا اور سندر کو مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تم نے انڈے دیکھے تھے؟"

"لکھمی کے سپرد کیے تھے۔"

"اس حرام کار کے سپرد؟۔۔۔ اس نے پانی میں ہی ڈال کر نہیں دیکھے۔ نصف انڈے گندے رہے ہیں۔ نصف، سن رہے ہو، میں یہ خسارہ تمہارے باپ سے، تمہارے دادا سے پورا کروں گا، سور کے بچے۔۔۔"

سندر نے ذرا تیز ہوتے ہوئے کہا۔

"پنچو مر رہا ہے اور آپ کو انڈوں کی پڑی ہے۔ یہ رہے، لے جایئے اپنے انڈے ونڈے۔۔۔"

باپو نے سندر کی بات کو نہیں سنا اور بولتا چلا گیا۔ آخر میں ایک چمٹا اٹھا کر سندر پر پھینک دیا۔ اس کی آنکھ بال بال بچی۔ باپو بولا۔

"لکھمی میم ہے نا۔۔۔ اسے کرسی پر بٹھا چھوڑنا چاہیے، کیوں؟"

سندر کی چھاتی غصّے سے بھرنے لگی۔ وہ بال بچّوں والا ہو چکا تھا، پھر بھی باپو اسے مارنے سے نہیں چوکتا۔ اس نے شعلہ فگن آنکھوں سے ایک مرتبہ باپو کی طرف دیکھا اور پھر بڑے چولھے میں دہکنے والی ڈبل روٹیوں کی طرف۔۔۔ اور وہی چمٹا

اٹھا کر ڈبل روٹیاں نکالنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے انڈوں کے لعاب میں انگلی ڈالی اور معاً ہی اس کی نظر کھاڑی کے اُس پار اُٹھ گئی۔ جہاں سے میمیں آتی تھیں، جن کی چھاتیاں چٹان کی طرح اُبھری ہوئی ہوتیں۔ جن کے جسم پر پھنس کر آئے ہوئے گون ان کے جسم کے ایک ایک عنصر کی وضاحت کرتے۔ ننگے بازو ڈبل روٹیوں سے بھی زیادہ نرم ہوتے اور پاؤں ہوا کی سی ہلکی سینڈلوں میں کنول کے پھولوں کی طرح۔۔۔

موٹی موٹی ڈبل روٹیوں، بسکٹوں اور سال میں بارہ مہینے دہکتے ہوئے دوزخ سے فرار کتنا جاں بخش ہوتا ہے۔ سندر کا تخیّل بہت زیادہ بیدار ہو چکا تھا۔ فیری کی نت نئی پیداوار تازیانہ بن جاتی تھی۔ وہ اکثر پانی میں ڈوبی ہوئی بید کی چھڑی اور دوسرے کنارے پر پتلی سی پانی کی لکیر کو بیک وقت دیکھا کرتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب سندر نے باپو کے سامنے دوسرے کنارے پر جا کر قسمت آزمائی کرنے کا عزم پیش کیا اور آخر ایک دن ہم سب لوگ نئے ''سیجن'' کے بھاری کام سے فارغ ہو کر کھاڑی کے کنارے پر جا موجود ہوئے۔ اس دن بھی کھاڑی میں طوفانی کیفیّت تھی۔ بڑی بڑی لہریں فیری کو تھپیڑے مار رہی تھیں۔ کچھ ماہی گیر

اپنے بڑے سے جال کو گھسیٹ کر کشتی کے ابھار پر پھینک رہے تھے۔ اس کے بعد انڈے لادے گئے۔ بڑے بڑے، وزنی انڈے جو دیسی مرغیوں نے لیگ ہارن مرغوں سے جفت ہو کر دیے تھے۔ اس کے بعد ہٹو ہٹو کی آواز آئی اور ہم نے دیکھا، تحصیلدار صاحب کا خانساماں اکرم جو ہمارے ہاں سے روز ڈبل روٹیاں لے جایا کرتا تھا، کسی چیز کو ایک خوبصورت شال میں لپیٹے ہوئے فیری کی طرف لایا۔ کچھ دیر بعد اس شال میں سے ایک بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ ہمیں پتہ چلا کہ وہ تحصیلدار کا لڑکا ہے۔ جو تین چار دن ہوئے میم صاحب کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے اپنے منجھلے بھائی کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے اونچا ہو کر دیکھا۔ بچّہ نہایت خوبصورت اور تندرست تھا۔ اس کے منہ پر گلے کے قریب ایک بہت ہلکی سی پھنسی نکل آئی تھی اور اسے مرہم پٹّی کے لیے دوسرے کنارے پر بڑے ہسپتال میں بھیجا جا رہا تھا۔

سندر نے فیری میں قدم رکھا۔ اس سے پہلے ہمارے گھر میں سے کوئی بھی آدمی رخصت نہ ہوا تھا۔ چار پانچ مہینے کے لیے بھی نہیں، اور آج یہ بھائی نہ جانے کتنی مدّت کے لیے مجھ سے جدا ہو کر اس پار جا رہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مرمّت

طلب گھڑی کی بابت سندر اور مجھ میں بہت سر پھٹول ہوئی تھی اور آخر وہ گھڑی میں نے اسے نہ دی۔ آج جب میں نے خود ہی وہ مرمّت طلب گھڑی اپنے رخصت ہوتے ہوئے بھائی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دے دی تو اس نے انکار کر دیا۔ بولا، ”رجو! بھیّا رکھو اسے تم۔۔۔ تم مجھ سے چھوٹے نہیں ہو کیا؟“

”نہیں تم لے لو اسے، سندر“ میں نے اصرار سے کہا۔

”جانے بھی دو“ سندر بولا۔ ”تمہاری کلائی پر کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ اے کاش! میرے پاس کچھ اور بھی ہوتا، جسے میں اپنے چھوٹے بھائی کو رخصت ہوتے ہوئے دے دیتا۔“

میں نے زبردستی وہ گھڑی اپنے بھائی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ ”اتنے بڑے شہر جا رہے ہو، وہاں قدم قدم پر وقت کی ضرورت ہو گی تمہیں۔ لو، لے لو، لو۔۔۔“

نہ جانے سندر کے جی میں کیا آئی، اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور روتے ہوئے اس نے میرا ناچیز تحفہ قبول کر لیا۔

بھابی نے حیا کی وجہ سے آنچل منہ کے سامنے کھینچ رکھا تھا۔ جب بھی جذبات اسے کچھ اجازت دیتے تو وہ سندر کے پاس فیری میں رکھی ہوئی گٹھڑی کی طرف اشارہ کر دیتی، جس میں اس نے کچھ مٹھیاں باندھ دی تھیں۔ وہ کہتی تھی۔ تمہارے دو چار دن کے لیے کافی ہوں گی۔ ہاں دیکھنا! انہیں گھی میں بھون رکھا ہے۔ ان کے کھانے کے بعد پانی نہ پینا۔ کھانسی ہو جائے گی اور اگر پانی کے بغیر نہ بھی رہ سکو تو پینے کے بعد پھر ان میں سے تھوڑااور کھالینا۔ گلہ صاف ہو جائے گا۔ تنور کی روٹی نہ کھانا۔ پیٹ میں درد ہو گی۔ اس سے تو آپ ہی تکلیف کر لینا اچھا ہے۔ دودھ روز نہ میسر آئے تو دوسرے تیسرے ہی سہی۔ مگر پینا ضرور۔ کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ تمہارے جسم سے تو کوا بھی سیر نہیں ہو سکتا۔ اے کاش! تم مجھے ساتھ لے چلتے اور میں تمہاری خدمت کرتی۔ تمہیں بوجھل تو نہ ہوتی۔ پھر دل میں کہتی۔۔۔ اس نامہر کے دل میں شاید میم کا شوق ہے۔۔۔ اور آنسو ٹپ ٹپ لکھمی کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

باپ نے رقت بھرے گلے سے کہا، "بیٹا! میں تمہیں مارا کرتا تھا، بیٹا!۔۔۔ ارے بھول جانا اس بُڈھے کے پاگل پن کو۔۔۔"

سندر جو اس وقت تک ضبط کیے ہوئے تھا، رو دیا۔ بولا "باپو! مارتے تو تھے تم، اور پھر خود ہی سینکنے کے لیے روئی بھی تو تلاش کرتے تھے۔ بھول گئے کیا؟"

اور فیری ہمارے مجروح دل کی طرح تھپیڑے کھائی ہوئی دوسرے کنارے پر چل دی اور ہم سب لوگ طوفان باد و باراں میں کھڑے صدری، چادر اور رومال ہلاتے رہے۔ آخر بارش نے ہوا میں اُڑنے والے کپڑوں کو بھگو دیا اور نظر کی کم مائیگی نے ہمارا یہ نحیف سا رشتہ بھی توڑ دیا۔

سندر کے چلے جانے کا اثر ہم سب پر بہت مختلف طریقوں سے ہوا۔ مثلاً میرا منجھلا بھائی سوہنا تمام دن غمگین رہنے لگا۔ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی۔ اسے سندر سے خاص لگاؤ تھا۔ اوپر تلے کے بھائیوں میں لڑائی بھی بہت ہوتی ہے اور محبّت بھی۔

میں بھی عموماً اُداس خاطر رہا کرتا تھا اور بات بات پر ماں اور بھابی سے جھگڑا کرتا۔

میں نہیں جانتا ہمارے جھگڑوں میں قصور زیادہ کس کا ہوتا ہے۔ اگر میں اپنی بے قصوری جتاؤں تو یہ یقیناً یک طرفہ فیصلہ ہو گا لیکن یہ بات تو ضرور تھی کہ اپنے بیٹے اور خاوند کی جُدائی کی وجہ سے وہ دونوں عورتیں رو رو کر چڑچڑی ہو گئی تھیں اور میری چھوٹی سی ضد کو بھی برداشت نہ کرتی تھیں۔

اور جب سندر کے تینوں بچّے بلکتے اور ننھا اپنی ماں کی بے دودھ چھاتی کو دانتوں سے کاٹ لیتا تو بھابی بڑے زور سے اُسے چارپائی کے نیچے دھکّا دے دیتی۔ اور پھر بچّے کے شور، ماں کی ملامت، باپو کی گالیوں، اور بھابی کے رونے سے گھر بھر میں کہرام مچ جاتا۔ اس وقت میں خوش ہو کر کہتا۔ اچھا ہوا سندر چلا گیا۔ اب وہ کم سے کم نائب تحصیل دار تو بن ہی جائے گا اور وہاں وہ بھی کسی پری کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہو گا۔ کیا عجب جو وہ اس وقت گھنٹہ گھر کے ارد گرد ناچ رہا ہو۔۔۔ ننگا۔۔۔

اس دفعہ گرما میں ہی سیجن آن پڑا۔ شاید صاحب لوگوں کا گرمیوں میں کبھی میلہ ہوتا ہے۔ جسے ایسٹر کہتے ہیں۔۔۔ نقو گوجرانی اپنی مہینے بھر کی محنت، ایک ہزار جوٹے اُپلوں کے پھینک گئی اور ہمارا بھاڑ دوزخی آگ سے دن رات پھنکنے

لگا۔ ہم دونوں بھائی نہایت محنت سے سنگتروں کے چھلکے سکھاتے، کوٹتے، انڈے پانی میں ٹیسٹ کرتے اور پھر دوزخ میں جا کر اپنی ازلی سزا بھگتتے۔

ایک دن سوہنے کی شکل نہایت مہیب ہو گئی۔ گھڑوں پسینہ اور اُس کے جذبات کے تاثرات نے مل کر اس کی شکل کو بہت خوف ناک بنا دیا۔ اس نے اپنی شعلہ فگن نگاہوں کو مُجھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"رجو۔۔۔"

میں نے بغیر جواب دیئے اپنا منہ اس کی طرف پھیر لیا۔ وہ بولا۔

"سندر تو چلا گیا ہے اُس پار۔۔۔۔ اور میں بھی چُپکے سے بھاگ جاؤں گا۔"

اس وقت میں ایک دغدغے کے احساس سے کانپا۔ آخر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے میں نے کہا۔ "اُلّو کہیں کا"!

"سچ کہے دیتا ہوں۔۔۔ باپو کو نہ کہیو، مجھ سے یہاں زندہ نہ رہا جائے گا۔"

میں نے خشمگیں ہوتے ہوئے کہا۔

”تو تمہارا مطلب ہے۔۔۔ میں یہاں اکیلا مرا کروں؟ تنہا ہی بھاڑ جھونکوں؟ واہ رے نواب کے بیٹے!۔۔۔ میں آج ہی کہہ دوں گا باپو کو۔“

سوہنے نے فوراً خوانچہ ایندھن پر پھینک دیا اور جھپٹ کر میری گردن دبوچ لی اور اس زور سے گلا دبایا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور شور بھی میرے گلے میں گھٹ گیا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور سوہنے نے میری گردن چھوڑ دی۔ لیکن شام کے وقت جب میں نے باپو کو دور سے دیکھا تو میں بھاگ کر اس کے پاس چلا گیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے سوہنے کی حرکت بیان کی اور اس کے خوفناک ارادہ سے مطلع کر دیا۔

باپو نے اسی وقت پانی میں بھگویا ہوا بید اٹھایا اور اسے سوہنے کی جسم کے ساتھ پیوست کر دیا۔ سوہنے نے بیت کی چھڑی پکڑ لی اور ایک جھٹکے سے باپو کے ہاتھ سے چھین لی۔ اسے توڑا، مروڑا اور پھینک دیا۔ باپو کے ہاتھ ایک لمحہ کے لیے لرز اٹھے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ سوہنا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا ہے۔ وہ ”حرام کار۔۔۔ حرام کار“ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور فیری کے مالک سے مل آئے اور اسے کہہ دیا کہ اگر سوہنا تمہیں کھاڑی سے پار جانے کے لیے کہے۔ تو

انکار کر دینا۔

سوہنے کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اب اس کے پاس سوائے اس بات کے چارہ نہ تھا کہ روز بلا ناغہ خمیرے آٹے کو ہوا میں اچھالے اور وہ گول چکر کاٹتا ہوا اس کے ہاتھوں میں آ گرے۔

ایک دن میں بھاڑ کے قریب سے اُٹھ کر، پسینہ سے شرابور، ہوا میں چلا گیا، اور مجھے بخار ہو گیا۔ اس کے بعد پھیپھڑوں کو ہوا لگ گئی۔ لیکن زندگی کے سانس باقی تھے، دارو درمن سے بچ رہا۔ ان دنوں سوہنا بیکری میں اکیلا کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی باپو ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ لیکن اب باپو بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کا کام کرنا، نہ کرنے کے برابر ہوتا تھا۔ ان دنوں سوہنا جب بھی میرے پاس تیمار داری کی غرض سے آتا، تو کہتا۔

"یہ دنیا دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ اس سے تو چھٹکارا ہو جائے تو اچھا ہے۔"

میں خاموشی سے کہتا۔

"ہاں سوہن۔۔۔ اور دیکھتے ہو، سانس بھی تو نہیں لیا جاتا۔ اس سے بڑا اور دکھ کیا

ہو گا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے۔ کہ میں۔۔۔؟"

سوہنے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"نہیں بھائی۔۔۔ اچھے ہو جاؤ گے تم۔"

"شاید پندرہ بیس دن اور تمہیں اکیلے کام کرنا پڑے۔ بڑی مصیبت ہے۔"

"کوئی نہیں، تم اچھے ہو جاؤ۔"

ابھی میں اچھی طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ مجھے دو چرواہے اپنے گھر کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کے بعد گھر بھر میں افراتفری پھیل گئی اور ڈھوک عبدالاحد کی دو گوجرانیاں آ گئیں اور بولیں "چوپال میں بڑ کے نیچے سوہنا مرا پڑا ہے۔"

میں اپنے آپ میں کچھ سکت پاتے ہوئے چوپال کی طرف دوڑا۔ وہاں قصبہ کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ انہوں نے میرے لیے خود بخود راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا، سوہنے کی دو آنکھیں باہر ابھر آئیں تھیں اور زبان ڈھیلی ہو کر منہ کے ایک طرف باہر نکل آئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک رسّہ پڑا تھا جسے وہ دودھ

دوہتے وقت اپنی گائے کی پچھلی ٹانگوں میں باندھا کرتا تھا۔ تو سوہنے نے خود کُشی کرلی اور تمام آگ اور خمیرے آٹے سے نجات حاصل کرلی۔ اب وہ تمام دکھوں تکلیفوں سے چھٹکارا پاکر اس چوپال میں، جہاں وہ بیٹھ کر اپنا حقّہ سلگایا کرتا تھا، اپنی گولروں کے بچھونے پر پڑا تھا۔ اسی جگہ جہاں وہ سندر کے ساتھ بیٹھ کر ناممکن الوجود سکھ کی زندگی کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔

میں نے بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے باپو کے شانے کو زور سے پکڑ لیا اور کہا۔

"باپو۔"

باپو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "باپو، اسے جلانا مت۔۔۔"

ڈھوک کا انچارج بولا۔ "تو سنسکار کیسے ہو گا؟"

میں نے باپو سے کہا "آگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہی تو سوہنے نے یہ کیاہے، باپو۔ کیا تم پھر اسے آگ میں پھینک دو گے؟"

سندر کو کئی خط واپسی کے لیے ڈالے گئے، لیکن اس نے ایک بھی خط کا جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا۔ وہ کہیں اپنی ہی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گا۔ ایک دو سال

بعد سوہنے کی موت کا غم کچھ ہلکا ہوا تو باپو کی باری آئی اور ایک دن وہ سونے کے لیے گئے تو پھر نہ اٹھے۔

اس کے بعد بیکری کا کام میرے ذمّے پڑ گیا۔ جب میں بہت مایوس ہوا تو پھر سندر کو ایک چٹھی لکھ ڈالی اور حسب معمول کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے سوچا، سندر اس پار، عیش و عشرت میں مشغول یہاں کیوں آنے لگے گا۔ اچھا ہوا جو وہ ادھر چلا گیا۔ اور جب میں نے زیادہ گہری نظر سے جانچا، تو میرے دل نے کہا سوہنے نے بھی اچھا ہی کیا، جو سب دکھوں تکلیفوں سے نجات حاصل کر لی۔

اور آخر ایک دن ہمیں ایک بوڑھا اپنی دکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے منہ پر سینکڑوں جھُریاں تھیں۔ میں نے نہیں لیکن میرے لہو نے پہچان لیا کہ وہ سندر ہے۔ میں دوڑ کر اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔ ہم سب بہت دیر تک روتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے اس کی ہیئت کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخر ان تاثرات کی بنا پر جو کہ میرے ذہن میں اچھی طرح منقّش تھے، میں نے سندر کو بناتے ہوئے کہا۔ "واہ رے، میرے نائب تحصیلدار۔۔۔"

سندر مسکرا دیا۔

میں نے پھر تنگ کرنے کی غرض سے پوچھا "اور وہ تمہاری میم کہاں ہے؟ یہ پوٹلی اسی نے دی ہو گی تمہیں؟"

اس وقت سندر کو ہلکی سی کھانسی آئی اور اس نے تنور کے قریب ہی تھوک دیا۔ مجھے اس کے تھوک میں ایک سُرخ دھبہ سا دکھائی دیا۔

میں دم بخود کھڑا سوچنے لگا۔ کیا دوسرے کنارے پر یہی کچھ ہے۔ یہی جھُریاں، یہی مریل سی ہلکی ہلکی کھانسی جس میں خون کا دھبّہ ہو۔۔۔ اور وہ سوہنا کس اُمّید پر مر گیا، کیوں؟ کس لیے؟ کس کنارے کی تلاش میں؟

اور ایک دن کھاڑی کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے سندر سے کہا۔

"سندر تم نے دیکھا ہے، وہ پانی کی لکیر کتنی آب و تاب سے چمکتی ہے۔"

سندر کھانسنے لگا۔ وہ ایک جگہ دم لینے کے لیے ٹھہر گیا اور بولا۔ "اس پانی کا بھول کر بھی خیال نہ کرنا رجو! وہ جو تمہیں چمکتا ہوا پانی دکھائی دیتا ہے وہ ریت کے چمکتے ہوئے لاکھوں ذرّے ہیں اور اگر یہ نیلی نیلی خوبصورت کھاڑی سوکھ بھی جائے تو وہ پانی نہیں سوکھے گا اور ابد الآباد تک چمکتا چلا جائے گا۔"

# آلو

لکھی سنگھ سائیکلو سٹائل کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا، اس وقت نہ تو اسے ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کا خیال تھا اور نہ خاکروبوں کی ہڑتال کے متعلّق تشویش تھی۔ آج شام کو گھر پکانے کے لیے کیا لے جائے، بس اسی بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ گھر میں صحن کا تین چوتھائی حصّہ چھوڑ کر باقی میں بسنتو نے پام اور پارا کر اس کے علاوہ پودینہ اور بینگن کے پودے لگا رکھے تھے۔ لیکن ابھی تو بینگن کے پودوں نے نیلے نیلے، اُودے اُودے پھول ہی نکالے تھے۔ ابھی تو ان میں

پگمنٹس (Pigments) کی نشوونما بھی اچھی طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں بینگنوں کا خیال کرنا تو محض ایک احمقانہ بات تھی۔

لکھی سنگھ شروع ہی سے پودوں کی کاشت کے خلاف تھا۔ حالانکہ بسنتو گھر میں ہریاول کو بہت پسند کرتی تھی۔ سبزی آنکھوں کو طراوت دیتی ہے، یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لکھی سنگھ نہایت بے صبر انسان تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج ہی بیج بو دیا جائے اور آج ہی پھل لگ جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلّق بھی اس کا کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ پودوں کو روزمرہ پانی دینا، ان کی نگہداشت اور پھر انہیں نہایت سُست رفتار سے بڑھتے دیکھنا، اس کی تاب وتواں سے باہر تھا۔ اسی لیے تو اس نے بسنتو کو صاف کہہ دیا تھا کہ پودے اُگانے کے بعد میں ولگا چلا جاؤں گا۔ وہاں دو چار ماہ رہوں گا تاکہ میری واپسی پر بینگن پھل رہے ہوں اور یہی محسوس ہو، جیسے میں نے کل ہی انہیں بویا ہے اور آج پھل بھی لے لیے ہیں۔

لکھی سنگھ نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ سب کامریڈ جا چکے تھے، لیکن اس کے کانوں میں ان کی پُر شور بحث کی گونج باقی تھی۔ پھر اسے خیال آیا، خاکروبوں کی ہڑتال کس قدر مکمل ہوئی ہے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں، گنجان آباد محلوں،

گزر گاہوں اور سڑکوں پر جا بجا کوڑے کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ شاہ عالمی کے باہر، گھوڑوں کے حوض کے قریب میلے کا پہاڑ پڑا ہے۔ ٹھنڈی سڑک کی طرف جانے والی سڑک پر تین دن سے ایک بیل مرا پڑا ہے جس کی لاش سے سڑاند اُٹھ کر ہسپتال کے مریضوں تک پہنچ رہی ہے۔ اس کے اپنے کوچہ بھولا مصر میں، جہاں شہر کے مردے جلانے والے اچارج رہتے ہیں، اتنا تعفّن پیدا ہو رہا ہے کہ اچارج باہر نہیں نکلتے اور ہندو کا مردہ بغیر اچارج کے کیسے جلایا جا سکتا ہے؟ یقیناً بہت سے مردے گلی محلوں میں پڑے بدبُو پھیلا رہے ہوں گے۔ ٹھنڈی سڑک کے قریب مرے ہوئے بیل کی طرح۔

کھڑکی میں سے ایک تیز بدبُو آنے سے لکھی سنگھ اُٹھا اور اس نے تمام دروازے بند کر لیے۔ دائیں طرف گھومنے سے اس کی نگاہیں سائیکلو سٹائل کے اوپر ایک کھونٹی پر جا پڑیں۔ اس کھونٹی پر کامریڈ بخشی کی ہیٹ ٹنگی رہ گئی تھی، جس کے ایک طرف سُرخ پروں کا ایک خوبصورت پلوم لگا ہوا تھا۔ آخر بخشی نے سرکاری ملازمت کر لی تھی، اس لیے سب کامریڈ مل کر برونگ کی نظم "وہ چند چاندی کی ٹکلیوں کے عوض ہمیں چھوڑ گیا" گاتے رہے تھے۔ بخشی رجعت پسند ہو گیا تھا۔

سب نے کامریڈ سے محبّت کی تھی اور راہبری کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے گیت گائے تھے۔ اس کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور اب۔۔۔ لیکن سو روپیہ ماہانہ پالینے پر بھی اس کا چہرہ اس قدر اترا ہوا تھا۔ وہ بار بار گھبرا کر اپنی پتلون کی کریز ٹھیک کرتا تھا اور بے تحاشا آنکھیں جھپکتا تھا۔۔۔ شروع بحث میں نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی اور اسے پیٹا بھی گیا تھا۔ اس کی قمیص کا ایک چیتھڑا ابھی تک ایک کرسی کے ابھرے ہوئے کیل میں اڑا ہوا تھا۔ اس نے پیٹ کی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے ہر ایک کے جذبۂ رحم کو اکسانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہاں سب کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ معلوم ہوتا ہے اتنے بڑے نصب العین سے گِر جانے کا اسے خود بھی احساس تھا۔ لیکن وہ ایک حد تک مجبور تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں، شادی کے قابل۔ ایک بوڑھا باپ۔۔۔ ڈاکٹر، جو کہ کسی ریاست سے ریٹائرڈ ہوا تھا اور جس کی بینائی زیادہ احتیاط کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ ماں کے علاوہ چار بھائی تھے، جن میں سے دو مقامی ہائی اسکول میں اور سب سے بڑا شہر سے باہر ایک کالج میں تعلیم پاتا تھا اور ان سب کے پیٹ ایندھن مانگتے تھے۔ بخشی نے ہر ایک کے اعتراض کا فرداً فرداً جواب دینے کی کوشش کی،

لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور پیٹے جانے کے فوراً بعد ہی وہ کمرہ سے باہر بھاگ گیا اور اس سراسیمگی میں اپنی ہیٹ بھی وہیں چھوڑ گیا۔

لکھی سنگھ نے کہا۔ "کاش! بخشی کا کوٹ ٹنگا رہ جاتا تو آج کی روٹی سے تو نجات حاصل ہو جاتی۔" پھر اسے بسنتو کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا۔ بسنتو صحیح معنوں میں کامریڈ ہے۔ اتنی خستہ حالت ہونے کے باوجود اس نے آج تک مجھے یہ یقین نہیں ہونے دیا کہ میں تم سے قلاش آدمی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مجبوری کے دنوں میں وہ میلے کچیلے چیتھڑے، ولگا سے آئی ہوئی گندم کا چھان، ایک گم نام سا پرچہ جس کا لکھی سنگھ ایڈیٹر رہا تھا، اس کی ردی بیچ کر کئی کئی دن گزار دیا کرتی تھی۔ وہ نام نہاد عزّت کے خیال سے کبھی نہیں ڈری تھی اور اپنے سوشلسٹ خاوند پر بار ثابت نہ ہونے کے لیے اس نے پڑوس کے لوگوں کی قمیصیں سینی شروع کر دی تھیں۔ ایک دفعہ اس نے کوڑیوں کے مول محلہ کے تمام لوگوں سے پھٹی ہوئی جرابیں خرید لیں۔ ان کے تار نکالے اور انہیں پاپڑ منڈی کے ایک جرابوں کے کارخانے میں بیچ دیا۔ بسنتو بڑی وسیلہ ساز عورت تھی اور لکھی سنگھ مطمئن تھا۔

لکھی سنگھ اٹھا اور ایک انگڑائی لی۔ وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہنسے لگا۔ ہنسنے کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا اور وہ ہنسی نہ رد عمل کی ہنسی تھی اور نہ کوئی درد تھا، جو حد سے گزر کر دوا ہو گیا تھا۔ وہ ایک بے معنی کھوکھلی ہنسی تھی جو کہ آناً فاناً جیب میں پیسے ختم ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے اور خیال آتا ہے۔۔۔ بھئی خوب رہی، چلو، بڑے دیش بھکت بنتے تھے۔ لیکن ایک کامریڈ کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ روس کا میخائلووچ۔۔۔

اور آخر رونے سے بنتا ہی کیا ہے۔ یہ بھی تو ایک وجہ ہے کہ ہنسا جائے اور لکھی سنگھ آہستہ آہستہ بیٹھک پر سے اُترا اور پریم محل سے نکل کر سرکلر روڑ کی طرف چل دیا۔ بازار میں کتّے دہی بڑے کے خالی پتّے چاٹ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کا دودھ سے بھرا ہوا آبخورہ بازار میں ِگر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور سرمئی سیاہ سڑک پر بکھرا ہوا دودھ اتنا بھیانک دکھائی دیتا تھا جیسے قحط کے دنوں میں گورنر کے فلاور شو کا کوئی بڑا سا کرائی سینتھیمم سر بازار رکھ دیا جائے۔۔۔ لڑکی حواس باختہ ہو کر آبخورے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی، گویا انہی ٹکڑوں کو سمیٹ کر گھر لے جائے گی۔

آسمان پر کاٹن مِل کے دھوئیں کی ایک لمبی سی لکیر چیمبر لین روڈ تک چلی آئی تھی۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا، تاہم فضا میں خنکی باقی تھی اور دھوئیں کے ٹکڑے آسمان کی سپیدی مائل نیلاہٹ کے خلاف دھبّوں کی صورت میں چار سو بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک ایک تیز سی بدبُو نے لکھی سنگھ کو ناک پر رومال رکھنے کے لیے مجبور کر دیا اور وہ سوچنے لگا۔ کمیٹی کی طرف سے اس میلے کے نکاس کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ لوگوں کے گھر غلاظت سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن پھر بھی لوگ برابر ایک پیٹ کی ضرورت سے زیادہ کھائے جاتے ہیں۔

اب تک لکھی سنگھ سبزی منڈی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ منڈی کے دروازے سے کچھ چھکڑے چیں چیں ریں ریں کرتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے بیل گردن کے قریب سے زخمی تھے۔ اس کے باوجود نہ تو جوت کو پرے کھسکایا گیا تھا اور نہ ہی لکڑی کے سخت لٹھّے اور اس پر زیبائش کے لیے لگائے ہوئے پیتل کے کیلوں کے گرد کوئی چیتھڑا لپیٹا گیا تھا۔ گاڑی بان بیلوں سے گزر کر ان کے مالکوں اور رکھنے والوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ گوال منڈی چوک کو اکالیوں کے

ایک لمبے چوڑے جلوس نے روک رکھا تھا۔ یہ لوگ سرگودھا میں مورچہ لگانے کی بابت سوچ رہے تھے۔ لکھی سنگھ نے اتفاق سے اپنا ہاتھ ایک چھکڑے کے پیچھے رکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک آلو آ گیا۔۔۔ یہ وہی چھکڑے تھے جو کہ ہر روز صبح سانده شمس الدّین کی طرف سے آلوؤں کی بوریاں لے کر سبزی منڈی کو آتے اور اپنی دانست میں تمام آلو انڈیل کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔ پھر بھی دھرے کے قریب یا کسی گانٹھ اور اونچ نیچ میں کوئی نہ کوئی آلو اٹکا رہ جاتا۔ لکھی سنگھ نے تمام چھکڑوں کے پیچھے سے ٹٹول ٹٹول کر سیر بھر کے قریب آلو اکٹھے کر لیے اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ آنسو نہ تو غم کے تھے اور نہ مسرت کے، بلکہ یونہی خلا میں ایک جذبۂ تشکّر و امتنان کا اظہار۔ یا وہ آنسو ایسے تھے جو خالی جیب کے آناً فاناً بھر جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

لکھی سنگھ نے گھر پہنچ کر تمام آلو بسنتو کے سامنے بکھیر دیے۔ آج بسنتو شام ہی سے لکھی سنگھ کی راہ تک رہی تھی۔ آج اس وسیلہ ساز عورت کو بھی کامریڈ کے آنے سے پہلے پہلے کوئی چیز پکانے کی ترکیب نہیں سوجھی تھی۔ اچانک اندر سے لکھی سنگھ کا بڑا لڑکا کرنیل نمودار ہوا اور رسوئی میں بکھرے ہوئے آلوؤں کو ہوا

میں اچھالنے لگا۔ لکھی سنگھ نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی اور آلو سمیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کمائی یونہی برباد کی جائے اور کرنیل رویا نہیں، کیونکہ ایسی باتیں تو ہر روز ہوتی تھیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ میسر نہ آتا تھا اور اس کے بعد جب وہ کسی چیز کی طرف حریصانہ نگاہ سے دیکھتا، تو ماں یا باپ کی طرف سے ایک چپت رسید ہو جاتی۔ اگرچہ کل کی چپت سے اس روز کی چپت زیادہ سخت تھی، تاہم اس سے کرنیل کو ایک اور شرارت کا موقع آسانی سے میسر ہو گیا۔ اس نے شیشے کے سامنے سے بام اٹھائی اور نصف سے زیادہ اپنے ماتھے پر مل لی۔ کرنیل کو بام ملنے کا بہت شوق تھا۔ اسے وہ پیشانی پر ٹھنڈی لگا کرتی تھی۔ وہ بام لکھی سنگھ نے بسنتو کے لیے خریدی تھی، کیونکہ وہ لیکوریا کی مریضہ تھی اور اسے ہمیشہ سر درد رہتا تھا۔ لکھی سنگھ نے بام کو ضائع ہوتے دیکھ کر دوسری گال پر بھی طمانچہ مارنے کی کوشش کی، لیکن وہ سوچنے لگا کہ بام تو پہلے ہی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔

اس وقت لکھی سنگھ کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بات بال بچّوں کی تربیت سے شروع کی اور کہنے لگا۔ بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے

آتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ بسنتو اس طور پر انگریزوں کی تعریف نہیں سن سکتی تھی اور عموماً بات یہاں ختم ہوتی تھی۔۔۔ ان لوگوں کے پاس بچّوں کو کھلانے کے لیے آیا ہوتی ہیں۔ روٹیاں پکانے کے لیے خانسامے۔۔۔ اور لکھی سنگھ ایسی باتیں سُن کر چپ ہو جایا کرتا تھا۔ سوشلسٹوں کے حلقہ میں وہ گھنٹوں بحث کر سکتا تھا، لیکن اس جگہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ حقیقت اتنی تلخ ہوتی تھی کہ اسے اپنے چہرے کا عکس دکھائی دینے لگتا۔ لیکن آج اس بات پر بھی بسنتو خاموش رہی۔ اچانک دروازے کی طرف سے سخت سڑاند آئی اور لکھی سنگھ گرج کر بولا۔ ”تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ کہ دروازہ بند کر لیتیں۔۔۔ بس نواب زادی ہی بننا چاہتی ہو تم۔“

بسنتو نے اٹھ کر چپکے سے دروازہ بند کر دیا۔

لکھی سنگھ اپنی داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سوئی لگا کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ بھوک کی وجہ سے اسے ڈکار آرہے تھے اور پیٹ میں ناف سے اوپر ایک عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی، جیسے سیلاب میں دریا کے کنارے، ایک پُر شور آواز کے ساتھ پانی میں گرتے ہیں۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے

اس کے پیٹ کی دیواروں سے کوئی چیز اندر معدے میں گر رہی ہے۔ یکایک لکھی سنگھ کو کچھ سوجھ گیا۔ پودوں کو اپنے سامنے پا کر بولا۔ ”بھلا ان بینگن کے پودوں کا فائدہ ہی کیا؟“

”فائدہ کیوں نہیں“؟ بسنتو نے آلوؤں کو دیگچی میں ڈالتے اور ہاتھ چھانٹتے ہوئے کہا۔ لیکن لکھی سنگھ اپنے مخصوص، دوآبیہ انداز سے گرجا۔ ”میرا تو جی چاہتا ہے کہ انہیں ابھی، اسی وقت اکھاڑ کر پھینک دوں۔ دو مہینے سے اوپر ہونے کو آئے ہیں اور ان میں پھل کا نام و نشان تک نہیں۔“

لکھی سنگھ اور بسنتو میں اس بات پر بہت جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ کڑھتی ہوئی بسنتو بولی۔ ”تبھی تو تمہیں بچوں سے نفرت ہے۔“

”بچّوں سے مجھے کاہے کو نفرت ہو گی؟“

”اٹھارہ سال کی عمر تک ان کی خدمت کا تم میں صبر کہاں ہے۔ ابھی سے کہہ رہے ہو کہ لکھمیر کو گانا سکھانا چاہتا ہوں، تاکہ وہ بچپن ہی میں کمانے لگے اور اسی عمر سے ہم اس کی کمائی کھانے لگیں۔“

لکھی سنگھ خاموش رہا اور مونگی توری کی بیل کے گرے ہوئے سرے کو کیل پر ٹانگنے لگا۔ بسنتو ماں تھی۔ اس میں بچّے اور پودے پالنے اور انہیں آہستہ آہستہ بڑھتے دیکھنے کا حوصلہ تھا۔ وہ ہر روز صبح اٹھتی اور کہتی۔ آج بینگنوں کو دو پھول لگے ہیں اور دو کی ڈنڈیاں پھول رہی ہیں اور مونگی توری پر بھی شہد کی مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ اب توریاں پھلنے کا موسم آیا ہے نا، اور تم نے آخر کرنیل سنگھ سے کس جگ کا بدلہ لینا ہے؟ آخر ہولے ہولے سمجھ دار ہو جائے گا۔ یونہی اسے پیٹتے رہتے ہو۔ لکھی سنگھ کو خیال آیا کہ مونگی توری کی بیل کو جہاں سے کاٹا گیا تھا، وہاں سے زیادہ سر سبز ہے۔ وہاں زیادہ کونپلیں پھوٹی ہیں۔ وہ فوراً بول اٹھا۔ ”یہ پودے کاٹنے چھانٹنے سے زیادہ نشو و نما پاتے ہیں، تبھی تو میں کرنیل کو مارتا ہوں۔“

جس دن لکھی سنگھ اور بسنتو کا جھگڑا ہوتا، اس دن بسنتو وہی ڈھیلا ڈھالا گلابی بلاؤز پہنتی جس سے لکھی سنگھ کو سخت نفرت تھی، اور وہ دوپہر تک سر کے بالوں کو سیدھا نہ کرتی۔ اپنے کپڑوں اور اپنی شکل سے وہ یوں سست اور زرد دکھائی دیتی، جیسے وہ حائضہ ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ کراہتی اور لکھی سنگھ آہستہ آہستہ کراہنے سے بہت گھبراتا تھا۔ زور سے رونے کا اس پر کبھی

اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہلکی ہلکی چیزیں مثلاً ہلکی کھانسی، ہلکا ہلکا بخار، ہلکا ہلکا ہنسنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت بسنتو اسے مزید تنگ کرنے کے لیے کھاٹ پر اوندھی پڑ جاتی اور پائنتی میں پاؤں اڑا کر یونہی زور لگانے لگتی اور بچّہ سفری پنگوڑے میں نصف دھوپ اور نصف چھاؤں میں ایک ہولناک آواز سے کراہتا رہتا اور پھر یک دم چیخ اٹھتا۔ جیسے اسے چیونٹیوں کے کسی دستہ نے یک لخت کاٹ کھایا ہو۔

ہنڈیا میں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ آلو اُبل چکے تھے۔ بسنتو نے انہیں سرد پانی میں انڈیلا اور لکھی سنگھ انہیں چھیل کر کھانے لگا۔ ان آلوؤں کے سوا گھر میں کچھ بھی نہیں تھا، اور لکھی سنگھ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ ان سیر آلوؤں میں بسنتو، کرنیل، لکھمیر اور بچّے کا بھی حصّہ ہے۔ وہ کہتا، ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آلو پیٹ کو غلیظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نمک مرچ لگا کر انہیں چٹخارے لیتا ہوا کھا لیتا۔ گویا کہہ رہا ہو، مجھے اپنے پیٹ کی غلاظت بہت پسند ہے۔

زندگی خوشگوار تھی۔ اس میں آسائش نہ تھی۔ سوہن حلوہ نہ تھا، لیکن آلو تو تھے اور لکھی سنگھ ہر روز شام کو چیمبر لین روڈ پر سے ہوتا ہوا سبزی منڈی کے قریب

جا کھڑا ہوتا اور سانده شمس الدّین کو لوٹنے والے چھکڑوں پر سے تمام آلو سمیٹ لیا کرتا۔ اٹھارہ تاریخ کو اسے ہندستان ٹائمز سے "گداگروں کے مسائل" کے مضمون کے پیسوں کی توقع تھی اور آج بارہ تاریخ تھی۔ پیٹ کی آگ کے لیے آلو کافی تھے۔

اچانک کمیٹی کی طرف سے بیل گاڑیوں کے لیے نیومیٹک ٹائروں کا بل پاس ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب گاڑیبانوں کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ سو روپے کے ٹائر کیسے مہیا کر سکتے تھے؟ کامریڈز کے ایک اجلاس نے گاڑی بانوں کی ہڑتال کروانے کا فیصلہ کر لیا اور لکھی سنگھ نے بھی ہڑتال کو کامیاب دیکھنے میں سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

ہڑتال کے پہلے ہی روز زندگی آلوؤں سے خالی ہو گئی تھی۔ یکسر خالی۔ ٹیوشن کی تلاش میں سارا دن گھر سے باہر گھومتے رہنے کے بعد لکھی سنگھ بسنتو کی وسیلہ سازی پر یقین کرتا ہوا ایک مجرم کی طرح گھر کے اندر داخل ہوا، لیکن بسنتو روزمرہ کی طرح آلوؤں کا انتظار کر رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی لکھی سنگھ غور سے بینگن کے پودوں کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن ابھی تک تو پودوں کے کلوروفل

نے بھی اچھی طرح سے نشو و نما نہیں پائی تھی۔

لکھی سنگھ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا، تا کہ وہ آلوؤں کے متعلق پوچھے ہی نہیں اور لڑنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے لڑ کر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر پڑ رہیں۔ لکھی سنگھ چاہتا تھا کہ اس لڑائی کے بعد ہمیشہ کی طرح بسنتو اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی دے اور وہ فوراً رضامند ہو کر اسے اسٹیشن پر بلا ٹکٹ گاڑی میں سوار کروا دے۔ لیکن آج بسنتو نے وہ گلابی بلاؤز نہیں پہنا ہوا تھا۔ آج اس نے دیل کی سفید دھوتی باندھ رکھی تھی جس سے لکھی سنگھ کو عشق تھا۔

اس وقت لکھی سنگھ نے بسنتو کو گاڑی بانوں کی ہڑتال کے متعلق بتایا اور آلوؤں کے نہ لانے کی وجہ بیان کی۔ بسنتو کچھ دیر اپنا سر ہاتھ میں دیے بیٹھی رہی۔ پھر وہ خشمگیں انداز سے لکھی سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے ہڑتال کی مخالفت کیوں نہ کی؟“

لکھی سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بسنتو ہڑتال کے محرکوں کو گالیاں دینے لگی۔ ان محرکوں کو جن میں اس کا اپنا لکھی سنگھ بھی شامل تھا اور جن میں سے بخشی محض اس لیے نکل چکا تھا کہ وہ آلوؤں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لکھی سنگھ

سوچنے لگا۔ بسنتو نے ایک اچھے کامریڈ کی طرح ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا، لیکن اب وہ بھی مجھے جواب دے رہی ہے۔ اس وقت کرنیل گلی میں سے آیا اور باپ کو خالی ہاتھ دیکھ کر رونے لگا۔ بسنتو صبح سے اسے باپ کی آمد کا انتظار کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو یوں روتا دیکھ کر بسنتو اور بھی زہرناک ہو گئی۔

لکھی سنگھ کو بسنتو سے یہ امید نہ تھی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ ''کیا بسنتو رجعت پسند ہو گئی ہے؟''

# معاون اور میں

وہ گنتی میں پانچ تھے، پورے پانچ۔ زرد رو اور پژمردہ سے چھوکرے۔۔۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے جان بخش ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے اور روشنی کی ایک کرن کے لیے ترس گئے ہوں۔ ان کی آنکھیں دور تک اندر دھنس گئی تھیں اور روشنی کے انحراف پر کھڑے ہونے کی وجہ سے صرف چند تاریک سے گڑھے دکھائی دیتی تھیں۔ اس سے پہلے وہ جہاں کہیں بھی تھے، ان کے بشرے کہے دیتے تھے کہ لاانتہا کام اور فکر نے ان کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔

بائیں طرف سے چوتھے، چق کے قریب کھڑے ہوئے لڑکے کے چہرے پر کی آڑی ترچھی لکیروں میں مجھے خود اعتمادی کے آثار دکھائی دیے اور جہاں باقیوں کی نظریں ''آقا'' کی متجسس نگاہوں سے جھینپتی ہوئی، دفتر میں لٹکی ہوئی پرانی کنزلے ریڈ کراس کے پوسٹر پر جم رہی تھیں۔ وہاں وہ اپنا لاغر سا چہرہ اٹھا کر ایک پر تمکین نگاہ سے میری طرف دیکھتے رہنے کی جسارت کر رہا تھا۔ میں نے ایک چبھنے والی نگاہ سے اس کے مٹیالے سیاہ رنگ کی اچکن پر لگے ہوئے پیتل کے، زنگ آلودہ بٹنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا کیا نام ہے؟''

''پتمبر لال۔''

''تعلیم؟''

''میٹرک پاس ہوں۔ ٹائپ جانتا ہوں۔ ساٹھ کی اسپیڈ ہے۔''

اس کی تعلیم اور ''اسپیڈ'' کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے میں نے پھر ایک نظر سے پتمبر لال کے پورے قد کو ماپا اور قدرے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں آپ نے پہلے بھی کہیں کام کیا ہو گا۔“

”اس سے پہلے میں تھوڑی سی مصوّری اور پھر بلاک بنانے کا کام کرتا رہا ہوں۔ بلاک بناتے وقت جست پر شورے کا تیزاب لگایا جاتا ہے۔ تیزاب کے دھوئیں نے میرے پھیپھڑوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں نے وہ کام چھوڑ دیا۔ ایک دو جگہ اور ملازمت کی اور پھر چھوڑ دی۔

میں حیرانی سے ان پانچوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی زمانہ کی دست برد سے نہیں بچا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا، تیزاب کے دھوئیں نے نہ صرف اس کا بایاں پھیپھڑا چھلنی کر دیا تھا، بلکہ دنیا کی خوفناک ترین بیماری اسے لگا دی تھی۔ اس بیماری کا اخفا مصلحت تھی، اس لیے پتمبر لال نے حقیقت کو چھپائے رکھا۔ بہت کچھ استفسار کے بعد مجھے صرف یہ پتہ چلا کہ میرے مقابل کھڑا ہوا لڑکا ایک خود دار انسان ہے۔ کسی کی ناجائز بات کو نہیں مانتا۔ اس لیے دو تین جگہ، جہاں بھی اس نے کام کیا، اپنی خود داری کو ٹھیس لگنے سے، چھوڑ دیا۔ اب وہ عرصہ سے بیکار تھا۔

یسوع کے وہ الفاظ ”تو منصف مت بن کہ تیرا بھی انصاف کیا جائے گا“ میرے

کانوں میں گونج رہے تھے۔ جب کہ میں نے پُر شکوہ الفاظ میں پتمبر لال کو کہا ”آپ کی اچکن کے زنگ آلود بٹن آپ کی صفائی پسند طبیعت کے داد خواہ ہیں۔ معاف کیجیے، مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔“ اس کے بعد مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پانچوں کو رخصت کر دیا۔

وہ زینہ سے اترتے جاتے تھے اور ایک پُر حسرت نگاہ سے میری طرف دیکھتے جاتے۔ پتمبر لال نے اپنا وہ چہرہ، جو میرے اظہار خیال کے بعد بہت ہی زرد ہو گیا تھا، اٹھاتے ہوئے ایک جگر سوز نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ شاید ایسی درد انگیز ٹیسیں بیسیوں ہی اٹھتیں اگر میں ذرا نمایاں طور پر اپنی ضرورت کا اعلان کرتا۔ اشتہار چھپوا کر اخباروں میں یا شہر کی مختلف گزر گاہوں پر لگاتا۔ میں نے تو قصداً خفی قلم سے لکھ کر اپنے دفتر کے دروازہ پر چسپاں کر دیا تھا کہ ضرورت ہے ایک محنتی اور قابل کلرک کی جو پندرہ روزہ رسالہ ”کہانی“ میں کام کرے۔ تنخواہ بلحاظ تجربہ ولیاقت۔

نہ معلوم میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے پتمبر لال کو واپس بلا لیا اور سترہ روپے ماہانہ پر اسے ”کہانی“ میں بطور معاون کے لے لیا۔ چند دن کے تجربہ کے بعد میں

نے دیکھا کہ پتمبر لال ان ملازموں میں سے تھا، جنہیں قدرت نے جبلّی طور پر آزاد بنایا ہو، لیکن زمانہ کے زیر و زبر نے انہیں "عبد" بنا دیا ہو۔ اخلاق جلالی کے مدبّر مصنّف نے ایسے ملازموں سے اپنے بچّوں کا سا سلوک روا رکھنے اور انہیں وہی پوشاک پہنانے کی، جو کہ خود پہنی جائے، تلقین کی ہے۔ مگر میں اس وقت ان آقاؤں سے مختلف نظریہ رکھتا تھا۔ حسب ہدایت مذکورہ مصنّف مجھے پتمبر لال سے ایسا سلوک کرنا چاہیے تھا کہ وہ والہانہ خدمت کرتا۔ مگر میں نے ایسا سلوک نہ کیا، بلکہ کبھی پتمبر لال کو یہ ذہن نشین نہ ہونے دیا کہ وہ ایک نہایت قابل معاون ہے۔ میں کام کے دوران میں اکثر یہ کہہ دیا کرتا کہ ایک معاون رکھ کر میں نے اپنے رسالے پر، جو کہ عمر کی اولیں منازل طے کر رہا ہے، ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔

جس روز بھی میں پتمبر لال سے ایسی باتیں کرتا، یا یوں قدرے درشت کلامی سے پیش آتا تو اس کا لازمی اثر یہ پڑتا کہ میرا معاون ایک نہ ٹوٹنے والی خاموشی اختیار کرلیتا۔ قلم کا ایک سرا منہ میں رکھ کر غیر حاضر دل سے کسی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا اور سوچتا رہتا۔ جہاں اس سے پہلے وہ لطیف باتیں اور چست فقرے کہتے

ہوئے خشک اور بے مزہ کام میں روح پھونک دیتا، وہاں وہ گھنٹوں خاموش رہتا۔ صرف بُلانے سے بولتا اور اپنی خامشی میں کبھی کبھار ایک گہری سانس لیتا۔

اس دن دفتر کی حالت بہت ابتر ہوتی فائلیں، الماری یا میز پر اوندھی سیدھی پڑی ہوتیں۔ شمالی دروازے سے جب ہوا کا تند سا جھونکا آتا تو کسی کھلی ہوئی فائل میں سے چند اوراق ''رسیدیں'' یا یادداشت کے کاغذ اُڑ کر فرش پر منتشر ہو جاتے۔ خریداروں کے خطوط کچھ قلمدان کے نیچے، کچھ میز کی درازوں اور کچھ اشتہاری چربوں میں مل جاتے۔ مسودات بڑی بے ترتیبی سے رکھے ہوتے غم و غصّہ سے کانپتے ہوئے پتمبر بابو کے کمزور ہاتھوں سے تھوڑی بہت سیاہی میز پوش پر ِگر کر آہستہ آہستہ پھیلنے لگتی۔ کرسیاں، جن پر افسانہ نویس آکر بیٹھتے، عجب بے ڈھنگے طور پر پڑی ہوتیں۔ اپنے افسانے کی تعریف میں ایک آدھ کلمہ سننے کے عادی افسانہ نویس، دفتر کی خامشی کو دیکھتے اور اپنے شہوانی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چل دیتے۔ پھر وہ مہینوں اپنے نادر افکار نہ بھیجتے۔ بعد میں مجھے ان کے سامنے گڑگڑانا ہوتا۔ بکھرے ہوئے ردّی کاغذ جنہیں میر اصفائی معاون عام طور پر اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کرتا تھا، ویسے ہی بکھرے پڑے رہتے اور دفتر پر

ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا جیسے اس دن ہم غیر معمولی طور پر مشغول رہے ہیں۔ گویا جذباتی ایڈیٹر کسی معرکۃ الآرا کہانی پانے پر میز کے ارد گرد ناچتا رہا ہے اور شاید جذبات سے مغلوب ہو کر کاغذوں، مسودوں، فائلوں کو اُٹھا اُٹھا کر چھت کی طرف پھینکتا رہا ہے۔

پتمبر لال کا اشتہار فراہم کرانے کا طریقہ بالکل نیا تھا۔ وہ مارکیٹنگ کے طریقے، اقتصادی حالات، مقامی باشندوں کی معاشرت اور ان کی خرچ کرنے کی اہلیت سے واقف تھا۔ نفسیات میں فطری طور پر دخل رکھنے کے سبب وہ "کہانی" کے سے گمنام اور نئے پرچے کے لیے اشتہار فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بلاک بنانے اور چھاپہ خانہ میں کام کر چکنے کی وجہ سے وہ طباعت کے عمل اور انگریزی ٹائپ کے رُخ کو بھی جانتا تھا۔ وہ اشتہار کو باقاعدہ دو یا تین حصّوں میں تقسیم کیا کرتا۔ مصوّر کے حصّہ کا کام وہ ایک خاص مصوّر کو دے کر دل پسند کام لینے کے علاوہ کمیشن بھی اینٹھا کرتا۔ ایک دفعہ تو اشتہاری مضمون اور تصویر کے پیٹنٹ کروانے کی سر درد بھی اس نے مول لے لی۔

کسی دوست کی وساطت سے پچھلے ماہ اس نے چندماہ کے لیے ریلوے کا مکمل صفحے کا

اشتہار لا کر خاصی آمدنی پیدا کر دی تھی اور وہ آمدنی اوائل عمر میں "کہانی" کو ایک بہت بڑی مدد تھی۔ اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پتمبر لال نے "کہانی" میں جان ڈال دی تھی۔ اس کی محنت ہی رسالہ کی کامیابی تھی۔ اس کے استعداد کی وجہ سے مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ پتمبر لال کہیں دفتر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے۔ چونکہ وہ خود بھی لکھنا جانتا ہے اور اشتہار بھی فراہم کر سکتا ہے کہیں وہ اپنا ہی کوئی رسالہ نہ نکال لے۔ چنانچہ اسی خوف کے رد عمل نے مجھے پیش قدمی پر مجبور کر دیا۔ میں نے کہا، "بابو پتمبر لال! تم اپنا ہی کام کیوں نہیں چلا لیتے۔۔۔ میں جانتا ہوں تم کام اچھی طرح سے نباہ سکتے ہو۔ معقول آمدنی کا ذریعہ پیدا کر سکتے ہو اور پھر۔۔۔ جب کہ تمہاری ساٹھ کی اسپیڈ ہے۔" پھر میں نے خود ہی کھسیانہ ہوتے ہوتے ہوئے کہا۔ "اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے ایک معاون کی ضرورت بھی تو نہیں رہی۔" پتمبر لال اس جملے کو متعدد بار سن کر تنگ آ چکا تھا۔ اس لیے سٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "ضرورت نہیں۔ تو مجھے بار بار کیوں سناتے ہیں آپ؟ کیوں نہیں مجھے۔۔۔"

اور بغیر بات کو مکمل کیے پتمبر لال خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے سر کو ایک

جھٹکا دیا۔ جیسے وہ تلخ حقائق سے دوچار ہونا تو کجا، اس کے تخیّل سے بھی گھبراتا ہو۔ میں جو کہ دراصل اس کی علاحدگی کو بغیر اپنے آپ کو گزند پہنچائے گوارا نہیں کر سکتا تھا یوں کانپ اٹھا جیسے مجھ پر ایک لخت کسی نے سرد پانی انڈیل دیا ہو۔ میں نے اپنی بات کو بدلتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو ضرورت ہے۔ مگر مستقل طور پر تو نہیں۔ بابو۔ بابو۔۔۔ میرا مطلب سمجھ گئے تم؟" پھر مجھے یوں محسوس ہوا، گویا میری بات تشنۂ تکمیل ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔ "میرا مطلب ہے، تم کیوں اپنا کام چلا کر ایک معقول آمدنی کا ذریعہ نہیں بنا لیتے؟" بظاہر میں نے وہی بات دہرائی تھی، لیکن اسے کہہ دینے سے میں نے دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھا دیا تھا۔

میرے معاون نے اپنا زرد اور فرطِ غم سے گرا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اسے کھانسی شروع ہو گئی اور ایک کانٹا سا اس کے گلے میں کھٹکنے لگا۔ اس نے منہ اور ناک پر رومال رکھ لیا، تا کہ ہوا مجھ تک چھن کر آئے۔ پانچ منٹ تک آہستہ آہستہ مگر لگاتار کھانستے رہنے سے بابو پیتمبر لال کراہنے لگا۔ جب ذرا دم سیدھا ہوا تو اس نے بائیں ہاتھ سے چشمہ اٹھا کر پیشانی پر سرکا دیا اور میری

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ ''لیکن کام کے لیے کچھ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تعجّب ہے کہ تم اکیلی جان سترہ روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔''

''پتمبر لال نے بات کرنے کے لیے حلق میں کھٹکنے والے کانٹے کو انگوٹھے سے دبائے رکھا اور نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو کس نے بہکا دیا کہ میں اکیلا ہوں۔ میری ایک بہن ہے، شادی کے قابل، اور ایک بیوہ بُوا ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ گو ماں باپ مر چکے ہیں۔۔۔ اور جناب! شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ آٹھ آنے کا تو وہی پالش آتا ہے جو کہ اچکن پر لگے ہوئے بٹنوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔''

اور اس بات کو سخت نفرت سے کہنے پر پتمبر لال ذرا بھی نہ جھجکا۔ اس کے بعد اس نے اپنا دبلا پتلا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پہلو سے روشنی کے خلاف پتمبر بابو کی پروفائل بہت ہی مہیب دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بات کیا کی، مجھے ایک

چپت لگا دی، جس کے سہے بغیر چارہ نہ تھا اور ابھی تو اس نے ذاتی خرچ کی ایک مد ہی بتائی تھی اور پھر اس کی بہن جو اسکول میں پڑھتی تھی۔۔۔ اور بیوہ بُوا۔۔۔

میں نے دل میں خیال کیا کہ میں نے اس نوعمر چھوکرے سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اپنی تمام خودداری اور خوداعتمادی کے ساتھ وہ مجھ سے کہیں بڑا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میں اس کا نوکر معلوم ہوتا ہوں۔ اس کے انداز گفتگو پر مجھے غصّہ محض اس لیے آیا کہ آخر میں آتا تھا۔

اس کے بعد میں نے پتمبر بابو کو کچھ نہ کہنا چاہا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کے خلاف طبیعت کوئی بھی بات ہونے پر فضا مکدّر ہو جائے گی اور میرے دل کا چین اور راحت چند گھنٹوں کے لیے بالکل فنا اور برباد ہو جائے گی۔ پتمبر لال کے تمام دن کبیدہ خاطر رہنے اور کام میں دلچسپی نہ لینے سے تمام فائلیں میز پر کھلی پڑی رہیں گی۔ وصول کرنے والے بل وصول شدہ بلوں میں پروئے جائیں گے۔ نئے آرڈروں والی چھٹیاں تعمیل شدہ آرڈروں کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں جا پڑیں گی۔ لکیریں کھینچنے کے لیے فٹ رول، باوجود کوشش کے نہ مل سکے گا۔ ڈاک خانہ میں جانے والے وی پی پیکٹ پر کوئی رقم اور فارم منی آرڈر پر مختلف رقم لکھے

ہونے پر ڈاک خانے کا خبیث سب پوسٹ ماسٹر چپڑاسی کو تمام وی پی واپس کر دے گا، تاکہ دفتر میں جا کر درست کرا لی جائیں۔ ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے میں نے چُپ ہی مناسب سمجھی۔ یہ نہ صرف پتمبر لال کے لیے اچھا تھا، بلکہ میرے اپنے لیے بھی۔ محض ذاتی مفاد، خود غرضی سے میں خاموش رہا اور میں اتنی دیر چپ رہا کہ مجھے کھجلی ہونے لگی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے کہا۔ "بابو۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں کہ منی آرڈر کے کوپنوں کا اندراج کرو، تب تک تم سوئے رہوگے۔ خود بخود نہ کروگے کیا؟"

پتمبر لال نے جواب دینا چاہا، مگر اسے چھینک آ گئی اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ تو سانس لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بات کیا کرتا۔

اس بار وہ ہفتہ بھر خاموش رہا۔

پتمبر لال کی شخصیت نے ہی دراصل مجھ میں احساسِ ذات پیدا کر دیا تھا، ورنہ اس سے پہلے زندگی کی مختلف دوڑوں میں مجھے کئی ایک خوشگوار اور ناخوشگوار

ملازموں سے پالا پڑا تھا، لیکن کسی کے سامنے مجھ میں آقا پن کی نمود اتنی شدّت سے نہ ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میرا اپنا ہی احساس کمتری تھا جو بہروپیا بن کر مجھے ستاتا تھا۔

کچہریوں کے اشتہار حاصل کرنے کے لیے میں نے پچھلے ماہ چند ایک اضلاع کا دورہ کیا تھا اور منصفوں کے سامنے اشتہار حاصل کرنے کے لیے گڑگڑایا تھا۔ لیکن اب تک صرف دو اشتہار ملے تھے۔ ان میں سے ایک سینئر سب جج گورداس پور کا تھا، جو کہ شریف اور خلیق جج نے اسی وقت دے دیا تھا، اور دوسرا تحصیلدار صاحب موگا کا تھا جنھوں نے عنقریب ہی بھیجنے کا وعدہ دیا۔

دسمبر کا آغاز تھا اور میں جانتا تھا کہ کرسمس کی گیارہ چھٹیاں ہو جانے پر ان سرپرستوں کی طرف سے پھر ہماری طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہو گا، اس لیے میں کچھ گھبرا سا گیا۔

ان دنوں پتمبر لال کچھ خوش تھا۔ میں نے احتیاطاً چند دنوں سے اپنے آپ کو اس کے راستہ میں آنے سے باز رکھا۔ وہ کاغذ کو اُوپر نیچے کرتا ہوا سیٹیاں بجاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ ''دتیا'' کی لاٹری سے اسے تیس روپے آئے تھے۔ لیکن ساتھ

ہی وہ اس بات کا معترف تھا کہ ان روپوں کے تصرّف کے متعلق سینکڑوں خیالوں نے اس کے ذہن کو پریشان کر دیا تھا اور اس کی نیند چھین لی تھی۔ اگر کوئی بات صحیح معنوں میں اسے سکون دیتی تھی، تو وہ یہ کہ اس کی بہن اسکول سے نکلتے ہی ایک زنانہ صنعتی اسکول میں چھوٹی لڑکیوں کو سلائی اور کروشیا سکھانے پر نوکر ہو گئی تھی اور اس وجہ سے پتمبر بابو کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کو دیکھ کر مجھے عدالتی اشتہاروں کا خیال بھی بھول گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں۔۔۔ کیا بات ہے بابو؟"

"نہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔" پتمبر نے گدگدی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد پتمبر نے دو ایک چست باتیں کیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا جو تمہاری بہن صنعتی اسکول میں جانے لگی ہے۔ کیا مشاہرہ ملے گا؟"
ایک پر غرور انداز سے پتمبر بولا۔ "پچیس روپے ماہانہ۔۔۔ مجھ سے بھی آٹھ روپے زیادہ۔"

اس وقت مجھے یوں دکھائی دیا، گویا فضا میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے، جسے پُر کرنے کی اشد ضرورت ہے اور کمرے کی تصویریں اور کنزلے اپنی اپنی جگہ سے

ہٹ گئی ہیں اور میز پر پڑا قلمدان اپنی جگہ سے بہت دور سِرک گیا ہے۔ فائلیں قدرے بے ترتیب رکھی ہوئی ہیں اور سب کچھ میرے ایک معمولی اشارے سے اپنی اپنی جگہ پر چلا جائے گا اور پھر میرے دل سے ایک بوجھ سا اتر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے کو کہتے ہوئے پایا۔ ”اب تو تم اپنی مشترکہ آمدنی سے کوئی اخبار جاری کر سکتے ہو۔“

پیتمبر لال نے ہنسنا بند کر دیا۔ وہ بہت رنجیدہ بھی نہ ہوا۔ گویا وہ میری ناقابلِ اصلاح طبیعت سے مانوس ہو چکا ہو۔ صرف چند ایک تیور اس کی پیشانی پر نمودار ہوئے اور وہ کھانستے ہوئے بولا۔ ”کہاں ؟۔۔۔اس کی تنخواہ تو ہم اس کے بیاہ کے لیے اکٹھی کیا کریں گے۔“

پھر جیسے پیتمبر کو کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ وہ کٹ کر اٹھا اور برآمدے میں جا کر اپنی خفگی کو سگرٹ کے دھوئیں سے پیدا ہوتے ہوئے حلقوں میں جذب کرنے لگا۔ اس کی میز پر بہت سے کاغذ بکھرے پڑے تھے، گویا وہ ابھی ابھی کچھ لکھتا رہا ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک سرسری نظر ان کاغذوں پر ڈالی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرانی اور کچھ خوشی ہوئی کہ عدالتی اشتہاروں کی بات، جو

چند دنوں سے مجھے سراسیمہ کر رہی تھی، پتمبر بھی اس کا حل سوچنے میں مصروف تھا۔ لیکن وہ چٹھیاں جو اس نے دلیری سے منصفوں کے نام لکھی تھیں، ان میں دوستانہ طریقہ تخاطب کو میں نے پسند نہ کیا۔ میں نے برآمدے سے پتمبر کو بلاتے ہوئے کہا۔

"پتمبر بابو! دیکھو نا۔ منصف اور جج کا عہدہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان سے ایسا دوستانہ تخاطب کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

بابو اس انداز سے میری طرف دیکھنے لگا، گویا اس کے سامنے کوئی نپٹ گنوار کھڑا ہو، اور بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنے پر کچھ بھی اعتماد نہیں ہے۔ آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ جرنلزم کتنا ارفع پیشہ ہوتا ہے اور سماج کے کتنے بڑے بڑے ارکان اخبار والوں کے دست تعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر ایک دکاندار کی حیثیت سے تو یہ لوگ پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ ان لوگوں کے سامنے ہمیں غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان لوگوں سے ایسے ہی تعلقات پیدا کرنے چاہئیں، گویا ہم رتبہ میں ان سے کسی طرح بھی کم نہیں۔"

"کچھ بھی ہو" میں نے اپنی بات کی رٹ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اس طرزِ تخاطب کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا۔"

اس کے بعد میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پتمبر کا چہرہ سنجیدگی اختیار کر گیا، اس لیے میں ڈر کر خاموش رہا۔ ۲۶ دسمبر تک ہمیں چھ عدالتی اشتہار موصول ہو گئے۔

تمام وہ لوگ جو کسی بھی مفاد کے لیے شب زندہ داری اختیار کرتے ہیں، ان کی بیویاں اعلانیہ طور پر انہیں کوسنے دیتی ہیں تا وقت کہ اپنی محنت کے اجر کا خوبصورت سا تخیّل، جس میں خوبصورت ساڑھیاں بھی دکھائی دیں اور بچّوں کے لیے گاڑی بھی، ان کے سامنے پیدا نہ کیا جائے۔ وہ شب زندہ داری سے متفق نہیں ہوتیں۔ میری بیوی کی ناراضگی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میں اسے یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ صبح فلاں سبزی پکائی جائے اور شام کو فلاں دال اور ہر ایسی بات پر اکثر گھر میں ناخوشگوار سی جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ آج میں گھر سے ہی جھگڑ کر سونے کے لباس اور سلیپروں میں دفتر چلا آیا تھا اور روٹی بھی وہیں منگوالی تھی۔ روٹی کھاتے وقت مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ آٹا بھی ختم ہے اور گھی بھی۔ اور شام کو کیا سبزی پکائی جائے؟

وائے قسمت آج پیتمبر لال پھر خاموش تھا۔ نہ معلوم اس ذکی الحس شخص کے جذبات کو کس نے ٹھیس لگائی تھی۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ کم از کم اس دن میں نے تو اسے کوئی رنجیدہ کرنے والی بات نہ کہی تھی۔ آج وہ گھر سے ہی ایسے آیا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پیتمبر بابو کی بہن مسلسل بیماری کی وجہ سے صنعتی اسکول کی ملازمت سے علاحدہ کر دی گئی ہے۔ پیتمبر کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب کچھ دوا دارو پر ختم ہو گیا۔ اب اس کے پاس علاج معالجہ تو ایک طرف، پیٹ کی آگ خاموش کرنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا، اور وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ بعض وقت بدنصیب انسان کو قدرت محض اس لیے کچھ دیتی ہے تاکہ پھر اس سے چھین لے۔ قدرت اپنی حزنیہ تمثیل کو مقامِ اوج تک پہنچانے کے بہت سے طریقے جانتی ہے۔

اس دن بھی میں پیتمبر لال سے خائف، ایک کونے میں دبکا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں پیتمبر لال سے اتنا خائف کیوں ہوں؟۔۔۔ آخر وہ میرا نوکر ہی ہے نا۔“ اس کے بعد ایک زبردست ردعمل میں مَیں یہ بھی بھول گیا کہ پیتمبر دو دن سے بھوکا ہے۔ میں نے مڑ کر کہا۔ ”بابو۔۔۔ آج شام کو کچھ

سبزی اور آٹا تو میرے گھر پہنچا آنا۔۔۔پیسے میں دیتا ہوں۔"

اور میں نے اس کا جواب سنے بغیر پیسے میز پر رکھ دیے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر پتمبر لال کی جگہ کوئی اور دفتر کا ملازم ہوتا، تو شاید میں اس سے یہ کام کبھی نہ کہتا۔ پتمبر لال حیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا رنگ زرد ہونے لگا۔ شانے پھڑکنے لگے۔ وہ بولا۔ "لیکن جناب۔۔۔ آپ نے دفتر کے کام کے لیے مجھے رکھا ہے۔نہ کہ نج کے لیے۔ معاف کیجیے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔"

میں نے کہا۔ "کام صرف پندرہ منٹ کا تو ہے اور میں تمہیں دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی دیتا ہوں۔

"خواہ دو گھنٹہ کی چھٹی دیں، یا دفتر کے وقت کے دو گھنٹہ بعد تک بٹھائے رکھیں، لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو گا۔"

"آخر اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

"دفتر کے کام اور نج کے کام میں بہت فرق ہے؟"

”فرق ہے!“ میں نے غصّے میں کانپتے ہوئے کہا۔ ”آپ جان بوجھ کر رزق کو دھکا دے رہے ہیں۔“

”بے شک۔“ مجھے دلیرانہ جواب ملا۔

”کل مہینہ ختم ہوتا ہے۔ براہ مہربانی اپنا بندوبست کر لیجیے۔“

اس وقت میری نظر ”کہانی“ کے تازہ ترین شمارے پر پڑی۔ اس میں آدھا ریڈنگ میٹر تھا اور آدھے اشتہارات اور یہ جو کچھ بھی تھا، پتمبر لال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کہانی کے رنڈاپے کے دن آ گئے۔

اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ پتمبر لال کے سامنے اپنے رویہ پر اظہار معذرت کروں اور اسے کہہ دوں کہ وہ بات صبح کے ناخوشگوار واقع کی وجہ سے ہو گئی ہے لیکن۔۔۔ آقا۔۔۔ نوکر۔۔۔

میں اس بات کو سوچتے ہوئے برآمدے میں چلا گیا۔ پیچھے سے میں نے قفل لگنے کی آواز سنی اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے چابی تالے کے قریب پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت پتمبر بابو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بازار کی طرف ہو لیا۔

اس وقت میں کنایتاً بھی نوکری چھوڑنے کا خیال پتمبر کے ذہن میں پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بآوازِ بلند پکارا۔

”پتمبر۔۔۔ پتمبر بابو، چابی لینا بھول گئے تم۔“

پتمبر چلتا گیا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ میں آقا پن کو ہمیشہ کے لیے پامال کر دوں۔ اسی سونے کے کپڑوں اور سلیپروں میں اس کے پیچھے دوڑ جاؤں اور گڑگڑا کر معافی مانگ لوں۔ راستہ میں میرا سلیپر کیچڑ میں دھنس کر رہ جاتا ہے، تو رہ جائے۔ کسی کار کے پائدان سے ٹکرا کر پٹڑی پر اوندھا گر پڑتا ہوں اور میرا سر پھٹ جاتا ہے، تو پھٹ جائے۔ آخر آقا پن اس سے کم ذلیل ہونے پر تھوڑے ہی معدوم ہوتا ہے۔

اور جب میں نے دوڑنا چاہا تو میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ موڑ پر پہنچتے ہوئے پتمبر نے صرف ایک دفعہ میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔۔۔ ”یہ ٹھیک ہے میں بھوکا مر رہا ہوں، لیکن اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ مجھ سے بھی برداشت نہ ہو سکے گا۔

# چیچک کے داغ

اب وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کسی کی تنقیدی نگاہ نہیں پہنچتی تھی۔۔۔لوہے کے بڑے کیلوں والے، بلند شہری پھاٹک کے پیچھے، جہاں ڈھور کا سارا گوبر بکھرا پڑا تھا اور اس کی بدبُو، ماگھ کی دھند کی طرح، سطح زمین کے ساتھ ساتھ تیر رہی تھی۔ جہاں اس کی بہن ایک بٹھل میں، گلی کی کسی زچہ کے لیے، گائے کا پیشاب لے رہی تھی۔ لیکن سکھیا نے تو ان کا منہ بہلی ہی میں دیکھ لیا تھا۔ اس پر چیچک کے بڑے بڑے اور گہرے داغ تھے، جیسے اس کے میکے ماتن ہیل کی موٹی ریت پر

بارش کے بڑے بڑے قطرے پڑے ہوں۔

اس نئے گھر کا رہن سہن کتنا پرانا تھا اور یوں بھی کچھ سوجھ والے ہاتھوں کا محتاج۔۔۔ دیواروں میں رنجیت شاہی چھوٹی اینٹیں، بوڑھے کاکا کے دانتوں کی طرح اپنے مرے ہوئے جبڑوں میں علاحدہ علاحدہ اور باہر ابھری ہوئی تھیں۔ دیواروں کی ٹیپ۔۔۔ سن، ماش اور چونا برس ہوئے اڑ چکا تھا۔ ایک دیوار پر مٹی اور بھوسہ ملا کر لیپن کیا گیا تھا۔ پھر اس پر چونا پھیر کر، گیروے رنگ سے، بڑے بڑے اور بد زیب ناگری حروف لکھ دیے گئے تھے۔ بھنڈارے کے قریب، ہنڈیا پر مہریا بیٹھی ایک بے محل اور بے سر گانا گا رہی تھی۔۔۔ اپجس (گناہ) کی مت باندھو گٹھڑیا۔۔۔ بیچاری مہریا! وہ ان گناہوں پر نادم ہو رہی تھی، جو اس نے کبھی نہیں کیے تھے، جو وہ کرنے کے اہل ہی نہ تھی۔ یا شاید وہ یہ گانا اس لیے گا رہی تھی کہ چھوٹے لالا کی شادی پر اسے بہت تھوڑا لاگ ہوا تھا۔

”ارے او لالا! تو کیوں کھڑا ہو رہیا کو برماں؟“

گھر کی اماں نے آواز دی۔ اس وقت بڑا لالا ناریل کا دم لگائے ہوئے، صحن میں کھڑا اماں پر ہنس رہا تھا۔ اب رام نام کے بعد میّاں نے کلی کر دی۔ بھلا کیا لابھ اس

پوجا پاٹ سے؟ رام نام ہی کلی کر دیا۔ واہ ری اماں! چپ رہے، گھر کی اماں نے ایک بھونڈی مسکراہٹ سے کہا اور پھر پوجا کی آخری قسط پوری کرنے کے لیے بڑھیا نے پیتل کی ٹوٹی پھوٹی سی لٹیا اٹھائی اور صحن کے مبہوت برہمن۔۔۔ پیپل کے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے پاؤں پر برف کا سا ٹھنڈا پانی گرا دیا۔ پیپل کانپ اٹھا۔ یا شاید یہ پروا کا جھونکا تھا، پھر پیڑ کے گھیر میں مولی کا سرخ اور زرد تا گا لپیٹ دیا۔ بڑے لالا کا چھوٹا لالا بہت نٹ کھٹ تھا۔ اسے چھوٹے بڑے، گلی گواہنڈ کے سب ''صاحب'' کہتے تھے۔ گھر کے سب لوگوں کے احتجاج کے باوجود اس نے ایک بیسا پِلّا پال لیا تھا اور باپ دادا کا جنم بھر شٹ کر دیا تھا۔ صاحب اٹھا تو پِلّا بھی ساتھ ہی۔ اٹھتے ہی پِلّے نے انگڑائی لی، منہ کھولا، زبان مچکائی، دھواں سا اڑایا اور صحن کے پیپل کے چرنوں میں پہنچ، ایک ٹانگ اٹھا، اپنے واحد طریقے سے پوجا کر ڈالی۔

سکھیا کے سر میں رات کے سو میل کے چکر باقی تھے۔ لاری کی گھوں گھوں، جھر جھر ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اسے گھیرے آ رہے تھے۔ بڑی نند نے چینی کی ایک پلیٹ میں لیموں کا اچار لا رکھا تھا۔ آ، ہا، چھی! سکھیا نے

بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ چینی کے ٹنڈر استعمال کریں۔ انہی جھوٹے برتنوں میں کھانا کھاویں۔ ملیچھ مسلمانوں کی طرح۔۔۔ چھی! اچھی بہن! جا تو ذرا، سکھیا نے قریب کھڑی، ان کی بھانجی کو کہا۔ کوئی مراد آبادی کٹوریا نہیں تمہارے ہیاں؟ اس میں تو لے آؤ تھوڑی سی چاٹ۔ متلی رُک جائے۔ ذرا میں چینی وینی کے برتن میں نا کھاتی۔ اور دلہن ناک چڑھا، ابکائیاں لینے لگی۔ بڑی نند، جی میں خوش ہوئی۔ اماں تو بوڑھی ہو گئی۔ وہ تو جھوٹے برتنوں اور دوسروں میں فرق کیا دیکھے گی، لیکن یہ۔۔۔ اب اس نیا کا کھویا آگیا گھرماں!

نند نے آپی پلیٹ اٹھائی اور ٹل گئی۔ بلند شہری پھاٹک کی اوٹ میں کھڑے وہ سکھیا کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انگریزی طرز کے بال کٹا رکھے تھے۔ نند کہہ رہی تھی۔ نکھلوئے سے بی، آپاس کیا جیرام نے۔ گھر سے پرے شہر میں، کنواروں کے مکان (بورڈنگ) میں رہتے تھے۔ جینؤ بھی نا پہنتے، سر پہ چوٹی بھی نا رکھتے۔ سکھیا نے جی میں کہا۔ یہ ملیچھ و دیا ہے نا۔۔۔ یہ رنگریزی (انگریزی) اور پھر ان چیچک کے داغوں کا کیا ہوگا؟ جب یہ خوفناک منہ قریب آئے گا تو طبیعت بہت گھبرائے گی اور کوئی لیموں کا اچار کام نہیں آوے گا۔ سب سو رہے ہوں

گے ، سب کچھ مجھے اکیلے ہی بھگتنا ہو گا۔ کیا دیکھا ان لوگوں کا چاچانے ؟ مجھے گھور نرک میں دھکیل دیا اور پلنگ پر پڑی، سکھیا سر زانوؤں میں دبا رونے لگی۔

محلہ ہجاری کی عورتیں ابھی تک دلہن کا کھرا کوٹا پرکھنے آرہی تھیں۔ دلہن کھری تھی، پانسے کا سونا۔ جس دھرم کانٹے میں کہو تل جائے۔ اسے منہ بسورے دیکھ کر آپ بھی منہ بسورنے لگیں۔۔۔ سچ ہے، ماں باپ بڑی دولت ہے کیسے چھوٹ جائیں ایک دن میں ؟ ایک عورت بولی، جب میری سادی ہوئی تھی تو۔۔۔ اس کے بعد وہ عورت سکھیا سے بھی اونچے سسکیاں لینے لگی۔ سکھیا حیران تھی۔ اس نے اس وقت تو ماں باپ کو یاد نہیں کیا تھا اور اس اَدھکڑ عورت کا نچلا ہونٹ، اونٹ کے ہونٹ کی طرح لٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس ادھکڑ کو آپ ہی بیاہ سادی کے گھر رونے کا اشگن محسوس ہونے لگا۔ اپنے دوپٹے سے اس نے آنکھوں کا سیل پونچھ لیا۔ دنیا کی یہی ریت چلی آئی ہے، بٹو! تو سکھ یہاں کا مانگ! تمہارے کاکا تو گئو روپ ہیں اور جے رام تو بیٹیوں جیسا بیٹا ہے۔ جبان کاں ہے منہ میں ؟ رات کو رات کہے، دن کو دن۔۔۔ ناچے گا تیرے اسارے۔

آج بڑا شبھ دن ہے، گھر کی اماں بولی۔ گلی میں جو امر تو ہے نا، اس کے ہاں بالا ہوا۔

تیرہ دن ہوئے پنجابیوں کے ہاں بیٹا ہوا۔ تبھی وہ آج گوئتر (گائے کا پیشاب) نہلاوے کے لیے لے گئی۔ یہ پھصل بیٹوں کی ہے۔ بیٹوں کی بہار ہے اور سادیوں کی۔ ادھر بیٹا ہوا، ادھر سادی ہوئی۔ اری! سمدری کی ماں۔ کاں رہا تیرا صاحب؟ بڑی بہو گھر آئی تو میں نے تیرا صاحب گودی ڈالا تھا۔ اوپر تلے تین بیٹے ہوئے۔ منجھلی کی گودی میں بٹھایا تو ٹپک پہلے سال لالا اور دوسرے سال بٹو۔ لیکن بٹو کا بری ہے۔ لالا سے بھی زیادہ موہوے۔ گودی ہری چھیئے اور کاں ہے وہ؟ میں اسے دلہن کی گود میں بٹھاؤں ہوں۔

سکھیا گٹھڑی ہو گئی۔۔۔ بیٹا اور چیچک کے داغ!

گوجر ڈھور کھولنے کے لیے آ گیا تھا اور ایک کمین لنگر لنگوٹا کس صحن کو پھاوڑے سے صاف کر رہا تھا۔ دھند، شرماتے ہوئے سورج کی کرنوں میں حل ہو رہی تھی اور بدبُو کو کمین کے تیج نے سمیٹ لیا تھا۔ دھند کا گھونگٹ اٹھتے ہی صبح کا چاند سا مکھڑا دکھائی دینے لگا۔ قصبے کے ہیجڑے، بٹ کر پنجابیوں کے ہاں اور ادھر گانے بجانے چلے آئے۔ اس وقت امرتو کے ہاں جمعدارنی سرس باندھ رہی تھی۔ سکھیا سبھی کچھ دیکھتی تھی، لیکن اسے سب کچھ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔

صحن کے دھوئے جانے سے 'یہ' ملے اور پلّے کو چمکارتے ہوئے بڑے بھیّا کے پاس چلے آئے۔ لیکن یہاں بھی یہی دکھائی دیتا تھا جیسے چھپ رہے ہیں اور اپنا چیچک سے بھرا ہوا چہرہ خود ہی دکھانے سے ہچکچاتے ہیں۔ سکھیا کے دل میں کچھ رحم سا پیدا ہو گیا۔ رام کسی کو بدصورت بھی نہ بنائیں۔ اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ مانتی ہوں، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، لیکن میرا کیا قصور ہے؟ میری شکل سے تو عورتیں جلتی تھیں اور ان کی شکل سے تو بھوت بھی نا جلیں۔

بڑی نند مرادآبادی برتن میں اچار لے آئی۔ سکھیا نے اپنی پتلی پتلی انگلیاں کشمیری فرو سے باہر نکالیں اور اچار کی طرف بڑھائیں۔ نند نے بھابی کی انگلیاں دیکھیں اور پھر اپنی موٹی گوبھی کے ڈنٹر کی سی انگلیاں، اور بولی، جیرام نے تو کوئی موتی دان کیے ہیں پچھلے جنم میں۔ سرسوں کی ناڑھ کی سی نازک اور لانبی انگلیاں ہیں، سچ بتا، سکھیا بھابی، کون سانچے میں ڈھالی تھیں تم؟

اتنا پریم؟ سکھیا سوچنے لگی۔ یہ رشتے ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ آپی آپ اتنا پیار ہو جاتا ہے۔ اس کی خاطر سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے۔ اس کے لیے ساس، سسر، جٹھانی، دیورانی، نند، نندوئی سبھی کی سہنی پڑتی ہے۔ لیکن جب وہی ایسی صورت کا

ہو تو کس کی سہے گا آدمی؟ افیم کا گولا کھا، سو رہے۔

"تو برتن بٹائے گی؟" نند نے پوچھا۔

سکھیا چپ رہی۔ وہ اس رسم کو ادا کرنے سے شرماتی تھی۔

نند نے سکھیا کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور منھ کو اوپر اٹھا دیا۔ آنکھیں بند تھیں جیسے بہت رس آ رہا ہو۔ ہونٹ سیپ کی طرح ملے ہوئے تھے۔ اوپر کے ہونٹ کی کمان کتنی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ نند نے کہا۔

"اچھی! ایک بات بتا۔" سکھیا نے سوال کی صورت میں آنکھیں کھول دیں۔ نند نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب عورتیں اپنے اپنے کام میں مشغول تھیں۔ "کیا جیرام نے تجھے دیکھا ہے؟" وہ بولی۔ سکھیا کا جی چاہا کہ وہ پوچھے۔ کون جیرام؟ اور پھر بڑا مزا رہے۔ لیکن اس نے منھ پرے ہٹا لیا اور گٹھڑی ہونے لگی۔ نند ایک دیہاتن تھی اور زیادہ طاقتور۔ اس نے دلہن کو سکڑنے نہ دیا اور پھر اپنا سوال دہرا دیا۔ سکھیا نے جان چھڑانے کے لیے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اسی شادی کے سلسلے میں کسی رسم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شاید وہی برتن بانٹنے

تھے۔ پرات میں دودھ اور پانی ملا کر کچھ روپے بھی رکھ دیے گئے تھے۔ کاکا ہلو ان کی گتھی لے آئے تھے۔ اس میں روپے ہی روپے تھے، تاکہ سکھیا ایک مُٹھّی میں جی بھر کر روپے نکال لے۔ نند نے بتایا، بہو کا ہاتھ بہت نازک ہے۔ کاکا جی ہی جی میں خوش ہوئے۔ ایک ہاتھ میں بہو زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپے نکال لے گی۔ کاکا کے قریب نندوئی کھڑا تھا۔ وہ گھر کا داماد تھا۔ چھوٹا نندوئی، اس کا حریف نہیں آیا تھا۔ اس نندوئی نے سر پر ململ کا پورا ایک تھان لپیٹا ہوا تھا۔ نیچے لمبا کوٹ وہ بھی لٹھّے کا اور کمر میں آدھی دھوتی نے اسے بہت مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ گھر کا داماد ہونے کی وجہ سے اس کی بہت پوچھ ہوتی تھی۔ وگرنہ وہ فوراً بگڑ جاتا تھا اور اس معتبر آدمی کے بگڑنے سے سبھی ڈرتے تھے۔ ایک جیرام اس سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسے نندوئی کے وجود سے شرم آتی تھی۔

سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ سکھیا کے کمرے کی کھڑکی سے دور زمین کا اونچ نیچ، دوشیزہ کی ان ڈھکی چھاتیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ان ٹیلوں کے قریب، کسی کھیت کی پنیری سرکی ہوئی انگیا سی بن گئی تھی۔ زمین اپنی عریانی کو چھپانے کے لیے دھند کی چادر لپیٹتی تھی، لیکن سورج اس کی ساری چادر کو کھینچ

لیتا تھا۔ آخر زمین بے بس ہو کر پڑی رہی۔ 'یہ' اب اور قریب آ گئے تھے اور سکھیا انہیں اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ دو منٹ کے قریب ایک ٹک جیرام کو دیکھتی رہی۔ جیرام کو ایک اور عادت بھی تھی۔ وہ پل دو پل کے بعد سر کو ایک جھٹکا سا دیتا تھا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ اِدھر آ جاؤ۔ شاید اسی لیے جیرام عورتوں کے قریب نہیں جاتا تھا۔ دو منٹ دیکھنے سے سکھیا کی نظروں میں چیچک کے داغ گویا دھل گئے اور جیرام کا چہرہ بے عیب دکھائی دینے لگا۔ سکھیا سوچنے لگی۔ جس طرح دو پل دیکھتے رہنے سے وہ چہرہ صاف دکھائی دینے لگا ہے، ساری عمر ساتھ رہنے سے شاید یہی منہ اتنا مانوس ہو جائے کہ چیچک کے داغ دیکھتے ہوئے بھی دکھائی نہ دیں۔

ہولے ہولے دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سکھیا نے کاکا کی گتھی میں ہاتھ ڈالا۔ اپنے ہاتھ کو پورا پھیلایا اور اسی پچاسی کے قریب روپے نکال لیے۔ سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ بہو بڑی چالاک ہے، اے کاکا! سنبھال کے رکھیو اپنی گتھی کو۔ بہت خرچیلی بہو آئی ہے۔ دوسری بولی۔ اتنا کمایا ہے کاکا نے دودھ سے، سات پشت تک کافی ہے اور کاکا کیا دھن کو سمادھی میں لے جائے گا؟ گھر کی امّاں اپنے کاکا کو

بچانے کے لیے نکل آئی۔ میرا جیرام کیا کم کماوے ہے؟ تین بیس سے اوپر ایک پاوے ہے ریلوائی ماں۔ دو جیو ہیں۔ کوئی بوجھ نہیں، باجھ نہیں۔ کھاویں، موج اڑا ویں۔

اچھا ہوا، سکھیا کو بھی ان کی آمدنی کا اندازہ ہو گیا۔ تنخواہ تو اتنی بری نہیں تھی۔ آج کل کہاں اکسٹھ روپے ملتے ہیں؟ انہوں نے چودہ جماعتیں پڑھی ہیں۔ تو کون سی بڑی بات کی ہے۔ سکھیا کے چچیرے بھائی نے سولہ پڑھی تھیں۔ اوپر سے ''کانون'' اور صوبے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آخر ایک ٹھگ کمپنی میں نوکر ہو گیا۔ اس کے بعد برتن بانٹتے تھے لیکن جیرام نہ آئے۔ شاید انہیں سکھیا کی نفرت کا پتہ چل گیا تھا اور وہ اکیلے میں اپنی صورت کو کوس رہے تھے۔ مہریا اپنی ہی ''گجل'' (غزل) گا رہی تھی۔ سکھیا نے کہا۔۔۔ اچبس کی مت۔۔۔ اور جیرام کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ گانا اس کے حسب حال ہے۔ جو بھی سنتا تھا مہریا کو یہ گانا گانے سے روکنا چاہتا تھا، لیکن روکنے سے پہلے ہر مرد عورت کو اس میں اپنی ہی زندگی دکھائی دیتی تھی اور وہ مہریا کو ڈانٹتے ڈانٹتے آپ اس کے رس میں غرق ہو جاتے۔

سکھیا نے جیرام کی تصوّر میں اپنے قریب آتے دیکھا۔ اس وقت سکھیا کو کمر سے نیچے سارا جسم جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یا پھر کانوں کی کنونیاں بھڑک رہی تھی۔ یہ اگن اتنی زبردست تھی کہ اس میں چیچک کے سب داغ بھسم ہو گئے تھے۔ داغ تو ایک طرف اگر چہرہ حبشی کا سا ہوتا تب بھی سکھیا کو کچھ محسوس نہ ہوتا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور یا پھر آگ کے شعلے تھے جس میں ایک مرد اور عورت کے مجسمے کندن کی طرح دمکنے لگے تھے۔

ان ہی خیالوں میں سکھیا جیرام کی شکل کو بھول چکی تھی۔ وہ بہت سی باتیں بھول جاتی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا۔ وہ رسم پر آئے کیوں نہیں؟ ذرا رونق ہو جاتی۔ اگرچہ دل نفرت سے دگ دگ کرنے لگتا، لیکن اسی نفرت کا اور کیا علاج ہے؟ یہی نا کہ اور قریب ہو جائے آدمی اور کسی کی تمام خامیاں، خوبیوں میں تبدیل ہو جائیں۔

وہ نہیں آئے۔ انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ مجھے ان سے نفرت ہے۔ سکھیا سوچنے لگی۔ جونہی میں نے منہ کے داغ اُڑتے دیکھنے چاہے تھے، توں ہی وہ چہرے سے اُڑ گئے۔ اب آنگن میں ٹہلنے والے کا منہ پھٹکار کی طرح دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ

ازدواجی زندگی کا پہلا دن تھا اور چیچک کے داغوں کو اتنا بھول گئی تھی۔ اتنا۔۔۔

دودھ رسوئی میں تسلے پر ایک کوڑیالے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگ میں گرنے لگا۔ ہوری اپجس کی گٹھڑیا۔ اماں نے مہریا کو آواز دی۔ کاہو گواتو کو؟ دودھ ابلتا وانا دکھے؟ رانڈ! اور پیسے مانگنے کو سر پر چڑھی چلی آوے۔ پیسے نہ دوں گی۔ راکھ جھونک دوں گی منہ ماں! اور ماں پپلاتے ہوئے منہ کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔

ڈھور شام کے قریب پھاٹک کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ دودھ بھی دوہا جا چکا تھا، پیتل کے دوہنے تخت پوش پر رکھے ہوئے تھے۔ کاکا داماد کی مدد سے تخت پوش پر بیٹھے ایک لال جلد والی بہی پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہے تھے۔ عینک بار بار منہ پر گرتی تھی۔ عینک کے کنارے ایک کند سفید رنگ کے ہو گئے تھے۔ کمانی کی جگہ ایک دھاگا کان تک چلا گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے کبھی کبھی ایک آدمی کے دو دو دکھائی دینے لگتے تھے۔

گھر کی عورتوں میں ہلکی ہلکی کھُسر پھُسر ہو رہی تھی۔ وہ کڑی نگاہوں سے جیرام کی طرف دیکھتی تھیں۔ سکھیا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کیوں نہ آئے۔ سکھیا نے پھر اپنے

آپ سے سوال کیا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے پھر ماتن ہیل یاد آیا۔ پھر جیرام۔۔۔ سبھی عورتیں جیرام کو کچھ کہہ رہی تھیں۔ گھر کی امّاں کی طرح سکھیا کو بھی جیرام کی طرفداری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ سندر چہرے پر اگر کالا داغ ہو، تو چہرہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔ مرد کماؤ ہو، شریف ہو، صحت مند ہو، تعلیم یافتہ ہو تو پھر چیچک کے داغ اس کی سُندرتا ہو جاتے ہیں، اور سکھیا اب تک ان چیچک کے داغوں میں خوبصورتی پا لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

رات ہوئی۔ سر جوڑی کے لیے جیرام کی تلاش ہوئی، لیکن جیرام غائب تھا۔ بڑی نند گھبرائی ہوئی آئی اور بولی۔

"سکھیا بہن، برا نہ ماننا، جوانی میں سبھی ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔"

سکھیا بولی۔ "کیا ہٹ دھرمی ہے؟"

"یہی بچپنا ہے نا، تھوڑا وقت گزر جائے گا۔ تو آپی آپ سمجھ آ جائے گی۔"

سکھیا حیرت سے نند کے منہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "جیجی! یہ کا باتیں ہیں

میری سمجھ میں تو نا آویں۔"

"کوئی بات بھی ہو۔" نند بولی۔ "جیرام کالج کا پڑھا وا ہے نا، اسے کھیال ہے کہ سکھیا کا ناک لمبا ہے۔۔۔ اسی لیے وہ رسم پر نہیں آیا اور اب کہاں لمبا ہے ناک تمہارا؟۔۔۔ تھوڑا وقت گزر جائے گا تو آپی آپ۔۔۔"

سہاگ رات اپنے تمام دھڑکے کے ساتھ سر پر آ رہی تھی۔ سکھیا نے چیچک کے داغوں کو معاف کرنے کی حد سے پرے جا کر اس میں حسن تلاش کر لیا تھا، لیکن جیرام اس کے ناک کو معاف نہ کر سکا اور رات، سرد، اداس، بے خواب رات گزرتی گئی۔۔۔ گزرتی گئی۔۔۔

# ایوِ الانش

جب میں کچھ پریشان سا ہوتا ہوں اور مجھے اپنا دل ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کے نیچے دبتا اور بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، تو میں اخبار بینی کرتا ہوں۔ یہ میرا شغل ہے۔

اخبار میں سکون کو تلاش کرنا ایک بعید الفہم بات ہے۔ لیکن یہ تو درست ہے کہ اس میں قتل، اغوا اور اس قسم کی بیہودہ سی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں اور دوسروں کی کمزوریاں اور مصیبتیں پڑھ کر دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر جاتا ہے۔ مجھے یوں

محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ سے کسی نے کوئی میگنی فائنگ گلاس چھین لیا ہو اور پھر کبھی کبھی ہریجن میں سے اقتباسات ہوتے ہیں۔

عجیب عجیب ناموں پر مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ مثلاً اس خبر میں۔

"سنگوریٖنی کلائریز (دکن) ۱۵ دسمبر۔۔۔ کوئلے کی کان میں سخت دھماکا ہونے سے ایک شخص مسمی گوروناتھ وینکٹارمیّہ کی موت واقع ہو گئی۔ متوفّی۔۔۔"

اس وقت میرے پاؤں میں سے سلیپر اتر جاتے ہیں۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک معمّر آدمی ہوں۔ چائے، جو کہ میں نے ابھی ابھی پی ہے، اسی کے چند قطرے میری داڑھی میں اُڑے ہوئے ہیں۔ گوروناتھ وینکٹارمیّہ۔۔۔ خدا کی قسم، کیسا عجیب نام ہے ہاہاہاہا!!۔۔۔ شیلا۔۔۔ رقو۔۔۔

شیلا، رقو اور میری بیوی جمنا، تینوں بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ کیسا دلچسپ نام ہے۔ تم نے دیکھا؟۔۔۔ تم نے دیکھا؟۔۔۔ گوروناتھ وین۔۔۔ کٹا۔۔۔ میّہ۔۔۔ ہاہاہی ہی اور ہم سب بھول جاتے ہیں کہ اس بیچارے کی موت حادثہ سے واقع ہوئی۔ ایک نہایت افسوسناک حادثہ سے، اور متوفّی کی شادی ہوئے ابھی صرف تین ماہ

ہی ہوئے تھے۔ جمنا، میری حساس بیوی سوچتی ہے، کس طرح بیچاری کی سُرخ چوڑیاں توڑ دی گئی ہوں گی۔ بھولی! نہیں جانتی دکن میں عورتیں سُرخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ اگر وہ سوچے کس طرح بیچاری کی مانگ کا سیندور پونچھ دیا گیا ہو گا تو شاید کچھ بات بھی بنے۔ جمنا آنچل سے اپنی نم ناک آنکھوں کو صاف کرتی ہے۔ شیلا اور رقو کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ تینوں پاگل ہیں۔ ہمیں گورو ناتھ کی موت سے مطلب؟ ایک سانس کے ساتھ دنیا میں سینکڑوں انسان مر جاتے ہیں اور پھر ان سے کہیں زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔ لیکن میرا دل دبا ہوا ہے اور۔۔۔ اخبار بینی میرا شغل ہے۔

"نندہ دیوی کے قریب ایک چوٹی کو سر کرنے کے لیے بین الاقوامی افراد پر مشتمل ایک پارٹی آ رہی ہے۔ چونکہ آج کل سردی ہے، پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہو گی۔ اس لیے پارٹی کے تمام افراد عنقریب ہی چڑھائی شروع کر دیں گے۔ ان افراد میں دو روسی ہیں، ایک اطالوی اور ایک جرمن عورت ہے۔ نام الیکسی نکولائی کوراٹپکن، سائنور نکولو پیگننی اور جرمن عورت کا نام فراؤ

کرپ۔۔۔ہی ہی۔۔۔ہی!!

موضع ہندال میں ایک معزّز کھڑ دنبہ خاندان کے ہاں برات آئی۔ لڑکی والوں نے جہیز میں پچیس تولے سونا، ایک ہزار روپیہ نقد، فرنیچر، بھینسیں اور بہت کچھ مال دولت دی۔ پھیرے کے بعد لڑکے نے اپنے سسرال سے کار مانگی۔۔۔

پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد میرا دل کانپنے لگتا ہے۔ ٹانگیں ڈگمگانے لگتی ہیں۔ آنکھوں پر سے عینک گر پڑتی ہے۔ اخبار چھوٹ چھوٹ جاتا ہے۔ میں اسی طرح بے تحاشہ آوازیں دیتا ہوں۔ شیلا، رقو، جمنا۔۔۔ ادھر آنا۔۔۔ کوئی نہیں آتا۔ یہ لوگ میری دیوانی عادتوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ گویا وہ مجھے میرے اخبار کے آخری کالم اور میری زندگی کے آخری سانس تک اکیلا چھوڑ دیں گے، تن تنہا، بے یار و مدد گار، دیوانہ۔۔۔ کیا کوئی کسی کا ہے؟۔۔۔ بیوی اور بچّے۔۔۔ رقو آجاتی ہے۔ اس کی آنکھیں اسی طرح نم ناک ہوتی ہیں۔ وہ اخبار کو پڑھتی ہے اور پھر آہستہ سے میرے کندھے کو چھوتے ہوئے کہتا ہے۔

”پتا جی۔۔۔ آپ نے آگے بھی پڑھا؟“

”نہیں بیٹی۔“

”پڑھیے۔۔۔ یہاں سے۔۔۔ انکار کر دیا اور آ گے۔۔۔ ہاں ہاں یہ یہ۔“

اور رقو کی چھنگلی سطر کے ساتھ ساتھ دوڑتی جاتی ہے۔ سطر کے الفاظ گُم ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اعراب ناچنے لگتے ہیں، ضرورت سے زیادہ لمبے ہو جاتے ہیں۔

”لڑکے نے اپنے سسرال سے کار مانگی۔ لڑکی والوں نے اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے انکار کر دیا اور ڈولی روک لی۔ برات کو ناکام واپس لوٹنا پڑا، اور ندامت سے اپنے تئیں بچانے کے لیے دولہا والوں کو نوشہ کی ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں ایک الھڑ، جاہل، دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔“

اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی بہت بڑا راجہ ہے، بہت بڑا فرعون، استبدادی، جس کے ہاتھوں کسی کی بھی عزّت محفوظ نہیں۔ اس کی رعایا نے اس کے جور و استبداد سے تنگ آ کر ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔۔۔ لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں، ہتھوڑے۔۔۔ بہت ہی اچھا کیا، میں کہتا ہوں، لڑکی والوں نے بہت ہی اچھا کیا۔

میرے مکان کی گھنٹی بجی۔ میں جانتا تھا صاحب رام آتے ہی ہوں گے۔ کپور، اڑھائی گھر میں بڑی اونچی ذات ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے چھجے پر سے جھانک لیا۔ یونہی۔۔۔ وہی تھے۔۔۔ کپور، امرتسری طرز کی سیدھی سی، کشتی نما پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ کالا، بند گلے کا کوٹ اور اریب پاجامہ، شانے پر شال رکھی تھی۔

میں نے جمنا کو بلایا اور پوچھا۔

"گدے تبدیل کیے ہیں جمنا؟"

"گدے؟ ہاں تو، کیے ہیں۔۔۔ نہیں کیے، صرف ان کے غلاف۔۔۔

"پھول دان؟"

اس دفعہ رقو آگے آئی۔ وہ جانتی ہے نا کہ میں اس کی ماں سے خواہ مخواہ کٹا رہتا ہوں۔ کسی کی بات کا غصّہ اس پر نکالتا ہوں۔۔۔ شاید اس لیے کہ میں اس سے بہت محبّت کرتا ہوں اور اس سے بہت کچھ متوقع ہوں۔

رقو بولی۔ "رکھ دیے ہیں پھول دان۔۔۔ اور اپنے کاڑھے ہوئے میز پوش بچھا

دیے ہیں۔"

اس وقت نہ جانے مجھے اپنی بیٹی میں کیا دکھائی دیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ایک دیوانے کے آشیر واد کے ہاتھ، رقو کے سر پر چھا گئے۔ رقو نے میرے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں گویا آنکھوں کے راستے سے وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی ہے۔ اری بھولی لڑکی! کیا یہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے کا وقت ہے؟ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو تم تینوں میں سے میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ کوئی بھی میرے جذبات کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ میری پرواز کے ساتھ نہیں اڑتا۔۔۔ تم سب مجھے سطحی سمجھتے ہو اور یہی تمہاری بھول ہے۔۔۔ باہر کپور کھڑے ہیں، بازاروں میں سودے ہو رہے ہیں۔۔۔ میں نے رقو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سب اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔"

صاحب رام آئے۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ نتھنے ضرورت سے زیادہ فراخ تھے۔ بھویں زیادہ گھنی تھیں اور کانوں پر لمبے لمبے سخت سے بال اُگ کر پگڑی سے باہر دکھائی دے رہے تھے۔ ماتھا اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ بس بالکل کال روپ تھے۔ بار بار شال کو سنبھالتے تھے، گویا اس کا مظاہرہ کرنا کوئی بہت ضروری

بات تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر رقو کے ہاتھ کے کڑھے ہوئے "سواگتم" (خوش آمدید) وغیرہ کو دیکھتے رہے۔ پھر تصویروں پر نظر دوڑائی اور نہایت احتیاط سے کرسی کو میرے قریب سرکاتے ہوئے بولے۔ "سب سے پہلے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے کہا۔ "معافی۔۔۔ آپ کا غلام ہوں۔ دیکھیے نا، دست بستہ غلام، آپ ہمارے صاحب ہیں، یہ رشتہ ہی کچھ۔۔۔" صاحب رام مسکرائے، جیسے کپور مسکراتے ہیں اور بولے۔ "میں نے سنا ہے، آپ کی رقو کی دو مرتبہ سگائی ہوئی تھی۔"

اس وقت میں نے دروازے کے پیچھے جمنا کی انگلی ہلتی ہوئی دیکھی۔ وہ مجھے اثبات میں جواب دینے سے منع کر رہی تھی۔ پھر اس کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔ جیسے تھیٹر میں ایک پرامپٹر ہوتا ہے لیکن پرامپٹر کا ہنر اسی بات میں ہے کہ حاضرین کو اس کے وجود کا پتہ نہ چلے اور صاحب رام سن رہے تھے۔ میں حقیقت سے اتنی جلدی انکار نہ کر سکا، میں نے کہا "جی ہاں۔" صاحب رام بڑے مؤدبانہ انداز سے بولے۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سگائی ٹوٹ کیوں گئی؟"

اس وقت میرے منہ میں لعاب خشک ہو گیا۔۔۔ رقو نے گل دان اچھی طرح رکھے اور پھول سلیقہ سے کاڑھے تھے۔۔۔ میں نے اپنی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے بتایا۔۔۔ وہ اس وجہ سے چھوٹ گئی کہ میں ایک غریب واش لائن انسپکٹر ہوں۔ رقو کو میں نے پڑھایا ہے لکھایا ہے۔ اچھی تعلیم دی ہے۔ آپ ایک غریب واش لائن انسپکٹر سے کیا متوقع ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ اپنی بیٹی کو تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیج دے گا؟ معاف رکھیے۔۔۔ باقی رہی دینے دلانے کی بات، میں نے رقو کو استطاعت سے زیادہ دینے کے لیے خاکروبوں، جمعداروں، سب ماتحتوں کے منہ سے نوالے چھینے ہیں۔

غنی محلہ میں نالیاں بنانے کا ٹھیکہ مہتاب سنگھ کو دلوا کر اس سے کافی بڑی رقم اینٹھی ہے اور اب اس کا پتہ چل چکا ہے۔ میرے بیان ہو چکے ہیں۔ میری نوکری، میری، میرے بچوں کی، میرے دو یتیم بھتیجوں کی زندگی خطرے میں ہے اور چونکہ میں جہیز میں زیادہ دینے کے اہل نہیں تھا۔۔۔ وہ رشتے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گئے، سنا آپ نے؟

صاحب رام نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ان سرخ ڈوروں

سے بھری ہوئی نگاہوں میں ایک رعشہ پیدا کر دینے والے معانی نظر آئے۔ گویا وہ میری رقو کو مشکوک چال چلن کی سمجھتا ہو۔۔۔ رقو۔۔۔ میری بیٹی رقو۔ کیا ایسی بھی ہو سکتی ہے؟۔۔۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہو تو میں صاحب رام کا دماغ پاش پاش کر دوں۔

صاحب رام بولے۔ "سردار صاحب، دیکھیے، میں کل بینک میں لڑکے سے ملا تھا۔ وہ اس بات پر بہ ضد ہے کہ ایک ہزار روپیہ بدائیگی میں رکھا جائے، فرنیچر سب کا سب ساگوانی ہو۔ ریڈیو اور اگر ایک ریفریجریٹر۔۔۔"

باقی کا میں نے نہیں سنا۔ صرف آخری الفاظ صاحب رام کے چلے جانے کے بہت عرصہ بعد تک میرے کانوں میں گونجتے رہے۔۔۔ "اجی، باروزگار لڑکے آج کل ملتے کہاں ہیں؟" مجھے یاد آیا، میری نوکری، میری زندگی۔۔۔ چھ زندگیاں خطرے میں ہیں اور شاید ایک دفعہ ایک راجہ کے جور و استبداد سے تنگ آ کر رعایا نے بغاوت کی تھی اور محل کے نیچے لاٹھیاں، گنڈاسے درانتیاں، ہتھوڑے۔۔۔ اچھا کیا۔۔۔ اچھا کیا!!

برسات کے دنوں میں دیودار کی لکڑی کے مسام پھیل جاتے ہیں اور دروازے

دہلیزوں کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازے کے پیچھے رقو اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازہ پٹ سے کھلا اور رقو کی پیشانی کے ساتھ ٹکرایا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں رقو کی خوب لاتوں گھونسوں سے مرمّت کروں، خوب ماروں اسے۔

لیکن ایک اور ہی جذبہ میرے دل میں عود کر آیا۔ انسان اپنے دل اور کردار کے متعلق خود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کون سا جذبہ، کون سا عمل سب سے اوپر جگہ پائے گا۔ میں نے رقو کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”رقا، میری بچی۔۔۔ زیادہ تو نہیں آئی چوٹ؟“

میں نے دیکھا رقو کو چوٹ کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی، یا وہ کسی اور ہی چوٹ کو سہلا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بدستور فرش پر گاڑے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کیا کہتے تھے؟“ اور پھر وہ کچھ شرما سی گئی۔

ایک پیرا میٹر کے بغیر میں نے سب کچھ چھپا لیا۔ میں نے کہا، میں رقو کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے سوچا، کوئی تعجّب نہیں کہ رقو خود ہی دروازے کے پیچھے سنتی رہی ہو۔ لیکن میں رقو کو کیوں بتاؤں؟ اس کی وہی چھنگلی ایک دن بردوان کی ایک

خبر پر دوڑ رہی تھی۔ اس خبر میں لکھا تھا۔۔۔ اپنے باپ کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے ایک لڑکی نے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگالی۔ میں نے رقو کو بالکل بچہ سمجھتے ہوئے گودی میں اٹھا لیا۔ پہلے تو وہ شرما دی، پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔

میں نے کہا۔ "وہ کہتے تھے لڑکی تو بہت سوشیل دکھائی دیتی ہے۔۔۔ پوچھتے تھے، یہ پھول اسی نے کاڑھے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ کہنے لگے کیا خوب ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں، پھر بولے، رقمن بہت اچھے اخلاق اور اطوار کی سنی جاتی ہے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں۔

اور اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جانے مجھے کسی نے زور سے گلے سے پکڑ لیا ہو۔۔۔ کچھ دیر بعد اپنے اصل کو چھپانے کے لیے میں نے رقو کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جاؤ۔۔۔ رقو جاؤ۔۔۔ جب میں اکیلا ہوتا ہوں۔ تو تم میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں آتا۔ کوئی بھی میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ کوئی بھی میری پرواز کے ساتھ۔۔۔ کیا میں سطحی ہوں، بے وقوف۔۔۔ اور جب میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ تو تم سب

میرے پاس آ جاؤ گے۔ جاؤ، مجھے اپنے اخبار کا آخری کالم اطمینان سے پڑھنے دو۔۔۔ ہاں! جمنا سے کہہ دینا ایک انگیٹھی میں بہت سے کوئلے ڈال کر بھیج دے۔ حرام زادی کو میری ذرا پروا نہیں۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ آج مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔ مرا جاتا ہوں مارے سردی کے۔۔۔"

رقو میری عادت سے واقف تھی۔ چپ چاپ چلی گئی۔ آپ ہی انگیٹھی لے آئی۔ میں نے اخبار کو اٹھایا۔ وہ بین الاقوامی افراد پر مشتمل پارٹی کنچن چنگا یا نندہ دیوی کے قریب کسی چوٹی کی بلندیوں کو سر کر رہی تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ یکایک برف کا ایک تودہ پھسلا۔ ایک بڑی سی ایوالانش نے انہیں آ لیا۔ پارٹی کے سب ممبر، چند تبّتی مزدور، خچر، سب دب گئے۔ شاید مر بھی گئے ہوں گے۔

جب ایوالانش آتی ہے، تو بڑے بڑے درختوں، چھوٹے چھوٹے پودوں، ہر نخل و ثمر کو بہا لے جاتی ہے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے ہیں۔ انسان، مویشی، پرند مر جاتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔۔۔ قحط سالی ہوتی ہے۔۔۔

اس وقت ان افراد کے نام پڑھ کر میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔۔۔ الیکسی نکولائی کوراپٹکن، سائنور نکلولوپیگننی اور جرمن عورت فراؤ کرپ، لی ٹن شانگ۔۔۔ لیکن مجھے ہنسی نہ آئی۔

اس کے دو تین بعد بہت سردی پڑی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا۔۔۔ رشوت لینے کی وجہ سے رقو شادی کی انسٹی ٹیوشن کو بڑی طنزیہ نگاہ سے دیکھنے لگی۔ مجھے تو اس کی عادتوں میں بے اعتدالی دکھائی دینے لگی۔ مجھے تو اس کے چلن پر بھی شبہ ہونے لگا۔۔۔ جمنا، میری دو بیٹیوں، تین بھتیجیوں کی زندگی خطرے میں تھی۔۔۔ اسی دن رقو دوڑی دوڑی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ بولی۔ ”کیا آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟“ میں نے کہا، ”نہیں“ اس نے ایک کالم میری آنکھوں کے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا، ایک ہوائی کموڈور کے تحت میں ایک ریسکیو پارٹی نے ایوالانش کی زد میں آئے ہوئے سب آدمیوں کو بچا لیا۔ میں نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیتے اور اس برفانی سخت سردی میں اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو سینک سینک کر دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کوئی ریسکیو پارٹی آئے گی؟ رقو!۔۔۔ کیا وہ ہمیشہ آتی ہے؟“